مدیر
علی محمد رضوی

سہ ماہی
اسلامی انقلاب

نائب مدیر
سید ارشد

مدیر منتظم: امین اشعر، مدیر معاون: صابر علی ☆ جلد ۱، شمارہ ۳۔ جولائی تا ستمبر ۲۰۲۵ء
مجلسِ تحریر: جاوید اکبر انصاری، سید یونس قادری، غلام جیلانی خان، سید ارشد، امین اشعر، صابر علی، علی محمد رضوی، کاشف شیخ، جاوید شیخ، مولانا حبیب الرحمٰن، سید رفیع الدین ہمدانی

فہرست مضامین

نعت شریف	مناظر احسن گیلانی	۳
اداریہ: قومی مفاد کا اسلامی انقلابی تصور	مدیر	۵
اسرائیل کو کیسے شکست دی جاسکتی ہے	جاوید اکبر انصاری	۱۰
ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری کی تجاویز پر تبصرہ	محمد یونس قادری	۱۴
اسلامی ایران کی عظیم الشان فتح اور۔۔۔	جاوید اکبر انصاری	۱۸
ایران کا جوابی حملہ	محمد یونس قادری	۲۱
اسلامی انقلابی تحریکات میں آئیڈیلزم کا اثر	انصاری، رضوی	۲۳
تصوف در نظر حجت الاسلام امام غزالیؒ	غلام جیلانی خان	۳۲
جہادِ افغانستان اور احیائے ریاستِ اسلامی	جاوید اکبر انصاری	۳۶
لبرل سرمایہ دارانہ ریاست کی حقیقت اور ماہیت	جاوید اکبر انصاری	۴۲
کیا ریاست جدیدیت و سرمایہ داری کی اختراع ہے	علی محمد رضوی	۷۰
ریاست درون ریاست کی تعمیر: اسلامی انقلابی تجزیہ	امین اشعر	۹۳
آئی ٹی اور جمہوریت	جاوید اکبر انصاری	۱۰۲
جدید سائنسی ترقی کا فریب اور دنیاوی ترقی کا خواب	محمد یونس قادری	۱۰۷
اسٹاک مارکیٹ پر اسلامی نقطہ نظر	محمد یونس قادری	۱۱۹
نظم اجتماعی میں عورتوں کی شمولیت	افغانستان مشاورتی گروپ	۱۲۹
جماعت اسلامی اعانت جہاد فلسطین میں کیا کر سکتی ہے	امین اشعر، جاوید شیخ	۱۳۳

Editorial: Ulema, Islamic Parties and the Imperative of Redefining the National Interest	Editor	137
A Note on Women's Access to Dawah Activities	WGAE	142
The Islamic Case for Excluding Women from Public Order	Javed Akbar Ansari	145
Three Characteristics of New and Old Khawarij: A Conceptual Note	Ali Muhammad Rizvi	151
The Geopolitical Reality: Iran, the US, and the Shifting Sands of the Middle East: An Afghan Perspective on the War	Dr. Abdul Hadi	157
Pakistan's Economic Subordination and the Failure of Stabilization	Younus Qadri	159
Certainty and Change in Capitalist Order: The Islamic Response to Digitalization	Javed Akbar Ansari	167
Financial Capitalism: An Islamic Revolutionary Approach	Javed Akbar Ansari	174
Rethinking the Stock Market: An Islamic Perspective on Modern Finance	Syed Muhammad Younus Qadri	183
Book Review: *Empire of AI: Dreams and Nightmares in Sam Altman's OpenAI*	Dr. Syed Z. Arshad	190

نعت شریف

مولانا مناظر احسن گیلانی

پیارے محمد ﷺ جگ ساجن
تم پر پر واروں تن من دھن
تمری صورتیا من موہن
کبھو کریو تو درشن
جیارا نکسے دلوا ترسے
کرپا کر کے بدریا برسے
تمری ڈوریا کیسے چھوڑوں
تم سے توڑوں کس سے جوڑوں
جی کا اب ارمان یہی ہے
آٹھوں پہر اب دھیان یہی ہے
تمری گلی کی دھول بٹوروں
تمرے نگر میں دم بھی توڑوں
پت اپنی بیت میں کا سے کہوں
مورا کون ہے تیرے سوا جاناں
مورا تن من دھن سب پھونک دیو
موری جان بھی پیارے جلا جانا

انتخاب: صائمہ جیلانی

اشعار

علامہ محمد اقبال

در دل مسلم مقام مصطفی است
آبروی ما ز نام مصطفی است
ما که از قید وطن بیگانه ایم
چون نگه نور دو چشمیم و یکیم
از حجاز و چین و ایرانیم ما
شبنم یک صبح خندانیم ما
مست چشم ساقی بطحاستیم
در جهان مثل می و میناستیم
خاک یثرب از دو عالم خوشتر است
ای خنک شهری که آنجا دلبر است

اداریہ: قومی مفاد کا اسلامی انقلابی تصور

قومیں (بطورِ سیاسی تصور کے) اور قومی ریاستیں سرمایہ دارانہ تعمیرات اور تصورات ہیں۔ اٹھارھویں صدی سے قبل دنیا میں کہیں بھی نہ قومیں موجود تھیں نہ قومی ریاستوں کا کوئی وجود تھا۔ پھر حرص و ہوس سے مغلوب سود خور اور سٹے بازوں کے ایک چھوٹے سے گروہ نے قدیم ریاستی ڈھانچے پر قبضہ کیا اور سرمایہ دارانہ معاشرت اور طرز حیات کو پہلے یورپ میں اور بعد میں پوری دنیا پر مسلط کر دیا۔

ظاہر ہے کہ قومی مفاد کا تصور قوم کے تصور سے جڑا ہوا ہے۔ اگر قوم نہ ہو گی تو قومی مفاد ایک لغو اور بے معنی تصور ہے۔ لہٰذا ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ قومی مفاد کا تصور اٹھارھویں صدی میں یورپی فکر اور سیاسی آویزش کی دریافت ہے۔

قومی مفاد کا تصور سرمایہ دارانہ عالمی نظاماتی کارفرمائی اور غلبے کے لیے ناگزیر تصور ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام حرص اور ہوس کو مہمیز دے کر ہی پنپ سکتا ہے۔ سرمایہ دارانہ عمل کے نتیجے میں مسابقت (competition) اور ارتکاز سرمایہ (capital accumulation) کو مستقل جاری رکھنا سرمایہ داری کی مجبوری ہے۔ یہ بات ان قومی اجتماعیتوں کے لیے بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی سرمایہ دارانہ افراد کے لیے ضروری ہے۔ سرمایہ داری ایک عالمگیریت ہے۔ اس عالمگیریت کا اظہار اسے مستقل جاری رکھنے والی مسابقت اور ارتکاز سرمایہ سے ہوتا ہے جو مستقل جاری رہتی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظاماتی بالادستی اسی مستقل جاری رہنے والی مسابقت کے ذریعے قائم رہتی ہے۔ اگر یہ مسابقت ختم ہو جائے تو سرمایہ داری نظام لازماً منتشر ہو جائے گا۔

چنانچہ سرمایہ دارانہ قومیں قومی مفاد کے حسب ذیل معنوں کو اخذ کرتی ہیں:

- قومی مفاد سے مراد یہ ہے کہ ان کی قومی ریاستیں زیادہ سے زیادہ سرمایے پر اپنا تسلط قائم کریں۔

- اس تسلط کے ذریعے اپنی قوم کے سرمایہ دارانہ حقوق اور فوائد کو زیادہ سے زیادہ حاصل کریں۔
- اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ دوسری تمام قوموں سے مسابقتی عمل میں سبقت لے جائیں۔ وہ قومی ریاستی سطح پر سرمایہ دارانہ ادارتی صف بندی اور پالیسی سازی کریں تاکہ زیادہ سے زیادہ سرمایہ ان کی طرف راغب ہو۔
- تحکم قانونِ سرمایہ (rule of law of capital) کے ذریعے غیر سرمایہ دارانہ رجحانات اور قوتوں کی بیخ کنی کی جائے۔

یہ تمام اہداف عالمی سرمایہ دارانہ نظاماتی بالادستی کے ضمن میں بھی لازمی ہیں۔ لہٰذا ہر سرمایہ دارانہ قوم کا قومی مفاد کا تصور اس کو عالمی سرمایہ دارانہ نظام کی وفاداری پر راضی / مجبور کرتا ہے۔

پاکستان کا رائج شدہ قومی مفاد کا تصور

پاکستان ایک قومی سرمایہ دارانہ ریاست ہے۔ انیسویں صدی سے قبل برصغیر کے مسلمانوں میں قومیت کا شعور بہت کمزور تھا۔ اس زمانہ میں اکبر نے کہا تھا:

دیکھا آج قوم کہتے ہیں جسے
چند لڑکے تھے مشن اسکول کے

سرسید غدار نے انگریزی تعلیم کے ذریعے مسلم قومیت کے تصور کو مسلمانوں کے اندر پھیلایا اور مسلم اشرافیہ کے ایک بڑے حصے نے اس تصور کو قبول کر لیا۔ ہندوؤں سے نفرت اور حسد کو مسلم عوام میں فروغ دیا گیا اور تحریک پاکستان کا ایک اہم حصہ ہندوؤں سے مسابقت اور نفرت پر مبنی تھا جس کی بنیاد پر مسلمان اشرافیہ نے نئی ریاست پاکستان قائم کی اور اس میں اقتدار سنبھالا۔ اس اشرافیہ نے جو خارجہ حکمت عملی وضع کی اس کی بنیاد اسی ہندو مسابقت اور نفرت پر رکھی۔

اشرافیہ کو احساس ہے کہ بھارت سے متوازن مسابقت ممکن نہیں کیونکہ بھارت نسبتاً ایک بڑا

اور طاقت ور ملک ہے لہٰذا بھارت سے مسابقت جاری رکھنے کے لیے پاکستان کو بیرونی امداد پر انحصار کرنا ہو گا۔ لہٰذا جناح صاحب نے اپنی ۱۱ اگست ۱۹۴۸ کی تقریر میں نہایت مؤدبانہ انداز میں امریکی دفتر خارجہ کا تہنیت کا پیغام پڑھ کر سنایا۔ اس تقریر کے اصل مخاطب امریکا اور برطانیہ تھے۔ جناح صاحب نے ان کو یقین دلایا کہ پاکستان ایک دہریہ (سیکولر) سرمایہ دارانہ ریاست بنے گا اور اس وقت سے لے کر آج تک ہماری اشرافیہ اس یقین دہانی پر استقامت سے قائم ہے۔

لہٰذا پاکستان کے رائج شدہ تصورِ قومی مفاد کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

- بھارتی تسلط سے نبرد آزمائی اور اپنی قومی خود مختاری کا دفاع اور فروغ۔
- ملک میں سرمایہ دارانہ اقتدار کا استحکام اور عوام میں سرمایہ دارانہ اقدار اور مفاسد کی مقبولیت کا فروغ۔
- سامراجی نظاماتی ڈھانچے سے وابستگی اور اس کی ماتحتی کو قبول کرنا۔
- زر کی عالمی مارکیٹوں money markets سے ایسا تعلق قائم کرنا جو ملکی معیشت پر ان کے تسلط کو دائمی بنائے۔
- زیادہ سے زیادہ سودی قرضوں اور بیرونی سرمایہ کاری کا حصول۔

اسلامی انقلابی تصورِ قومی مفاد کے رہنما اصول

ہم اسلامی انقلابی ہیں اور ظاہر ہے کہ ہم قومی مفاد کا یہ تصور قبول نہیں کرتے۔ ہمارے ساتھی محمد یونس قادری نے قوم پرستی پر اپنے تجزیے میں تحریر فرمایا ہے کہ دورِ حاضر میں اسلامی حکومت کا قومی مفاد اس میں ہے کہ وہ عالمی سرمایہ دارانہ نظام سے اپنے آپ کو آزاد کروائے اور بالآخر عالمی سرمایہ دارانہ نظام کو کمزور کرے۔

ہم کس حد تک اپنے آپ کو عالمی سرمایہ دارانہ نظام سے آزاد کرواسکتے ہیں اور کس حد تک اس کو کمزور کرسکتے ہیں یہ ہماری اندرونی قوت اور عالمی اسلامی قوتوں اور سرمایہ داری کی اپنی قوت پر منحصر ہے۔ ہم فی الحال اسلامی انقلابی جدوجہد کو قومی ریاستی تناظر کے سیاق میں ہی کارفرما

کرنے پر مجبور ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ سامراجی غلبے نے امت کے فعال وجود کو منہدم کر دیا ہے اور جو اسلامی ریاستیں قائم ہیں (ایران اور افغانستان) وہ بھی اسی نظام کی بالادستی کو اصولاً برداشت کرنے پر مجبور ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم سامراجی نظاماتی ٹوٹ پھوٹ اور اندرونی بڑھتے ہوئے تضادات سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

ان ریاستوں نے تصور امت کی تشکیل نو کا بیڑا اٹھا رکھا ہے جس کا اظہار ان کی جہاد فلسطین کی اپنی استعداد کے مطابق اعانت سے ہوتا ہے۔ دونوں اسلامی ریاستوں (ایران اور افغانستان) نے قوم پرستی کو شدت سے رد کیا ہے۔ ہم ان کوششوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور حتی الوسع ان ممالک کی مدد کرتے رہیں گے۔

اسلامی ممالک (ایران اور افغانستان) کے استحکام کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود کفالت اور خود انحصاریت پر زور دیتے رہیں (اور اس ضمن میں ایران نے دفاعی شعبے میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ہے)۔ ایسے معاہدے مرتب کرنے کی ضرورت ہے جو ان ممالک میں سرمایہ دارانہ نظاماتی تحکم کو کمزور کریں۔ یہ ایک پیچیدہ اور دشوار گزار کام ہے۔ ہم اسلامی ممالک (ایران اور افغانستان) میں اس قسم کے بین الاقوامی معاہدے ترتیب دینے کی کوشش کریں گے۔

جہاں تک غیر اسلامی مسلم ممالک مثلاً پاکستان کا تعلق ہے وہاں ہماری ریاستی دسترس نہایت محدود ہے۔ ان ممالک میں ریاستیں سرمایہ دارانہ سامراج کی باجگزار ریاستیں ہیں۔ لہٰذا قومی مفاد کے تناظر میں اسلامی انقلابی جدوجہد کا مرکز معاشرہ ہو گا اور ہمارا مقصد معاشرے کے اندر سامراج کی گرفت کو کمزور کرنا ہو گا۔ اس ضمن میں تین اقدامات ناگزیر ہیں۔

۱. مخلصین دین کی قیادت میں عوام کو مساجد، مدراس، اور خانقاہوں کے اردگرد منظم کرنا تاکہ وہ پہلے مقامی سطح پر اور پھر نظاماتی سطح پر بااختیار ہوں اور ریاستی قوت بتدریج سرمایہ دارانہ ریاست سے منتقل ہو کر مخلصین دین کے ہاتھوں میں آ جائے۔

۲. قوم پرستی بالخصوص پاکستانی قوم پرستی کے خلاف جدوجہد، قومی مفاد کے سرمایہ دارانہ تصور کے خلاف جدوجہد اور تصورِ قوم کی نفی اور عوام میں امت کے تصور اور شعور کو اجاگر کرنے کی جدوجہد کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس بات کو سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت ہے کہ ہمارا قومی مفاد سعادت کی زندگی اور شہادت کی موت کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

۳. اسلامی سیاسی قوت کو سامراج نواز پالیسیوں کے خلاف استعمال کیا جائے۔ ایسی پالیسیوں کی تشکیل و تائید کی جائے جو ہمارے تصورِ قومی مفاد سے متعلق ہوں اور جن کو فی الحال ہمارا ملک اختیار کرنے کی استطاعت رکھتا ہے: مثلاً آئی ایم ایف سے کیے گئے معاہدوں کی معطلی، بین الاقوامی سودی قرضوں کی ادائیگی سے انکار، امریکی درآمدات پر مستقل پابندی وغیرہ۔

یہ نہایت دشوار گزار اور پرخطر راہ ہے۔ اس تصورِ قومی مفاد پر عمل پیرا ہونے کا مطلب یہ ہے ہے کہ ہم ایک ایسی جدوجہد کی ابتدا کر رہے ہیں جو لازماً صدیوں پر محیط ہو گی۔ سرمایہ دارانہ سامراجی نظام کو منتشر ہونے میں صدیاں لگیں گی۔ دور حاضر کے اسلامی انقلابی سرمایہ داری کے خلاف اسلامی یلغار کا ہراول دستہ ہے۔ ہمیں شکستوں اور ناکامیوں کو برداشت کرنا ہو گا۔ اس راہ میں استقامت دکھانی ہو گی۔ دور حاضر میں اسلامی انقلابی جدوجہد اقامت دین کا فریضہ ادا کرنے کی جدوجہد ہے۔

اسرائیل کو کیسے شکست دی جاسکتی ہے

جاوید اکبر انصاری

ایران پر جون ۲۰۲۵ء کے اسرائیلی حملوں سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ اسرائیل طویل المدت جنگ لڑنے پر آمادہ ہے اور اس جنگ کے پھیلاؤ کے نتیجے میں پورے مشرق وسطیٰ میں امریکی تسلط کے قیام کے لیے کام کر رہا ہے۔ لہٰذا مشرق وسطیٰ میں جنگ کے اصل فریقین وہاں کی اسلامی قوتیں اور امریکا ہیں۔ ہم نے حال ہی میں امریکا کو افغانستان سے نکالا ہے تو ہم امریکا کو مشرق وسطیٰ سے کیوں نہیں نکال سکتے۔

امریکا یہ جنگ اپنے پٹھو کے ذریعے لڑ رہا ہے۔ یہ ایک پراکسی جنگ ہے جس میں امریکا کے حربی اتحاد میں صرف اسرائیل نہیں کئی عرب ممالک (مصر، لبنان، اردن اور عرب امارات) بھی شامل ہیں۔ ایران کا براہ راست مقابلہ اسرائیل سے ہے اور اس ملک کی عسکری کمزوریوں سے واقفیت ہماری فوری ضرورت ہے۔

اسرائیل کی عسکری کمزوریاں

اسرائیل ایک نسبتاً چھوٹا ملک ہے اور اس کی بڑی جنگ لڑنے کی استطاعت محدود ہے۔ لہٰذا اسرائیلی فوج (آئی ڈی ایف) کا زیادہ انحصار فضائی جنگ پر ہوتا ہے۔ ایران کی بری فوج اگر اسرائیل میں داخل ہو جائے تو IDF کو بآسانی شکست دی جاسکتی ہے۔ اس راہ میں رکاوٹ امریکی حلیف ممالک ہیں جو اپنے ملک سے ایرانی فوج کو گزرنے نہیں دیں گے۔

اس جنگ کو ایک زمینی جنگ میں تبدیل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اردن، شام، عراق کی اسلامی قوتیں عوامی دباؤ کے ذریعے ان ممالک کی حکومتوں کو ایرانی فوج کے گزرنے کی اجازت دلوائیں۔ کل تک لبنان میں یہ ممکن تھا۔ آج اردن اور شام میں اس کی کوشش کی جا سکتی ہے۔

ہمیں اسرائیل کے اندر گھس کر یہ جنگ لڑنی ہے۔ حماس کی عدیم المثال فراست سے ثابت

ہوا کہ آئی ڈی ایف اپنے ملک اور مقبوضہ علاقے میں جنگ لڑنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ یہ بات آئی ڈی ایف کی غزہ میں ناکامی سے ثابت ہے۔ اسرائیل اور مغربی ساحل کی اسلامی قوتوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ حماس سے سبق سیکھیں۔ جنگ کو یروشلم اور تل ابیب کی گلیوں اور محلوں تک وسیع کرنے کی کوشش کریں۔ یہ بالکل ممکن ہے اور اس ضمن میں لاطینی امریکی گوریلوں کی مزاحمت سے بھی بہت کچھ سیکھا جاسکتا ہے۔ حماس کے اسرائیل میں پھیلے ہوئے زیر زمین نیٹ ورک کو وسیع اور مضبوط کرنے کی بھی اشد ضرورت ہے۔ آئی ڈی ایف کی شہری جنگ لڑنے کی صلاحیت بھی نہایت محدود ہے۔

اسرائیل کے اندر کارفرما جمہوری نظام کو بھی جنگی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ جنگ سے اکتاہٹ کے اشارے نمایاں ہیں اور کم از کم حزب اختلاف کے بیش تر دھڑے یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ اسرائیل یہ جنگ نہیں جیت سکتا اور یہ جنگ نیتن یاہو اپنی حکومت کو بچانے کے لیے لڑ رہا ہے۔ لہٰذا جمہوری نظام کو استعمال کر کے نیتن یاہو کی حکومت کو گرانا بھی اسلامی قوتوں کا ایک ہدف ہونا چاہیے۔

ایران کے جوابی حملے سے ثابت ہو گیا ہے کہ امریکی تعاون کے باوجود اسرائیل کی تکنیکی برتری فیصل نہیں اور اسلامی حکومت کو اس طریقے سے شکست نہیں دی جاسکتی۔ لہٰذا جلد یا بدیر وہ اس جنگ کو مصالحت کی بنا پر ختم کرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ ہمارے لیے اہم بات یہ ہے کہ یہ مصالحت ایران کی نیوکلیئر استطاعت میں اضافے کے مقابلے میں نہ ہو۔ جنگ بندی ایسے سمجھوتے پر منتج نہ ہو جو ایران کے لیے نیوکلیئر ہتھیاروں کے حصول کو مشکل یا ناممکن بنا دے۔ جنگ نے ثابت کر دیا ہے کہ ایران کا نیوکلیئر پروگرام تیزی سے ترقی کر رہا ہے اور اسے جلد یا بدیر نیوکلیئر ہتھیار حاصل کر لینا چاہیے۔ یہ اس کی ملکی سالمیت اور علاقے میں اسلامی غلبے کے لیے ضروری ہے۔

اس ضمن میں پاکستان کی اسلامی قوتوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ پاکستانی حکومت کو اس بات پر راضی یا مجبور کریں کہ وہ ایران کے نیوکلیئر پروگرام کو تحفظ فراہم کرے۔ بھارتی امریکی

عسکری تعاون کے حالات میں یہ ایک موثر قدم ہو سکتا ہے جو ملکی سالمیت کے تحفظ کے لیے اٹھایا جانا چاہیے۔

ہماری جنگی حکمت عملی کا مقصد فضائی جنگ کو بری جنگ میں تبدیل کرنا ہے جو اسرائیل کے اندر لڑی جائے گی اور طویل مدت تک جاری رہے گی۔ اس کا اختتام اس وقت ہو گا جب اسرائیلی ریاست تحلیل ہو گی۔ اس حکمت عملی کو کارفرما کرنے کی استطاعت صرف اسلامی ایران میں ہے۔ علاقے کی تمام اسلامی قوتوں کو ایران کا پشت پناہ ہو جانا چاہیے۔

امریکا سے مقابلہ

امریکا یہ لڑائی ایران کے اندر بھی لڑ رہا ہے۔ موساد کا تخریب کاری کا جال نہایت وسیع ہے اور ایرانی فوجی اطلاعاتی نظام کو گھیرے ہوئے ہے۔ اس کے علاوہ اسلام دشمن قوتیں عوامی سطح پر بھی موجود اور متحرک ہیں۔ ایران میں ایک بڑی تعداد یہودیوں کی بھی ہے جو تخریب کاری میں ہمیشہ پیش پیش رہی ہے۔ ان عناصر کی نشان دہی اور ان کے خلاف سخت ترین تادیبی کارروائی کی ضرورت ہے۔ عین ممکن ہے کہ امریکا اور اسرائیل عوامی سطح پر اسلامی حکومت کے خلاف مزاحمتی تحریک برپا کرنے کی کوشش کریں۔ اس قسم کی مزاحمت کو کچلنے کے لیے عوامی تحرک کو فروغ دینے کی اشد ضرورت ہے۔ ہر کڑے وقت میں ایرانی عوام نے اسلامی حکومت کی پشت پناہی کی ہے۔ اور توقع کی جاسکتی ہے کہ اس مرحلہ میں بھی ایرانی عوام پر اعتماد جہاد کے حمایتی ثابت ہوں گے۔

جہاد کو جاری رکھنے کے حق میں عوامی مہم مستقلاً چلانے کی بھی اشد ضرورت ہے۔ ہمیں یہ جہاد اس وقت جاری رکھنا ہے جب تک اسرائیل کا وجود صفحۂ ہستی سے مٹ نہ جائے۔ ایران اور حماس نے اس عظیم کام کا بیڑا اٹھایا ہے۔ یہ جہاد مختلف مرحلوں میں داخل ہو سکتا ہے لیکن اس کا اختتام اسرائیلی ریاست کو فنا کر کے ہی ہو گا۔

یہ لڑائی امریکا پوری مسلم دنیا میں لڑ رہا ہے اور اسلامی ملکوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ جہاد میں حصہ لیں۔ افسوس کی بات ہے کہ بحیثیت مجموعی مسلم ممالک کے عوام اس جہاد سے لاتعلق

ہیں۔ اس لاتعلقی کو ختم کرنے کے لیے اسلامی قوتوں کو مندرجہ ذیل اقدام کرنے چاہئیں۔

۱. ایران کے حق میں ملک گیر مظاہروں کا تواتر سے سلسلہ شروع کیا جائے جس میں شیعہ سنی اتحاد کا مظاہرہ کیا جائے اور حکومت پر دباؤ ڈالا جائے کہ وہ ایران کی عملی حمایت کرے۔

۲. ان مظاہروں اور دیگر مہمات میں امریکا کی اسلام دشمنی واضح کی جائے۔

۳. واضح کیا جائے کہ امریکا کا اصل مقصد مشرق وسطیٰ کے تمام ممالک پر اپنا تسلط قائم کرنا ہے بالخصوص ایران کے بعد پاکستان، سعودی عرب اور مصر نشانے پر ہیں۔ ان ممالک کی خود مختاری چھین لی جائے گی۔

۴. امریکی مخالفت کو اسلامی سیاست کا کلیدی محور بنایا جائے۔

۵. عوامی سطح پر مسلم ممالک میں قائم امریکی اڈوں کا مستقل گھیراؤ کیا جائے۔

۶. امریکی درآمدات کا بائیکاٹ موثر انداز میں کیا جائے۔

۷. امریکا سے معاشی، تجارتی، صنعت کاری انقطاع کی مہم جاری کی جائے اور ان بین الاقوامی معاہدوں اور اداروں سے انخلا کی مہم چلائی جائے جو امریکا کے زیر تسلط ہیں۔

۸. امریکا سے مواصلت بالخصوص تارکین وطن کی آمد و رفت پر پابندی لگانے کی مہم چلائی جائے اور جو نوجوان مسلم ممالک چھوڑ کر امریکا میں رہائش اختیار کر رہے ہیں انہیں ملک کا غدار قرار دیا جائے۔

ڈاکٹر جاوید انصاری کی تجاویز پر تبصرہ

سید محمد یونس قادری

ڈاکٹر صاحب کے مضمون "اسرائیل کو کیسے شکست دی جاسکتی ہے" میں اسلامی قیادت کو جو مشورے دیے گئے ہیں، ان میں سے پانچویں اور ساتویں نکتے براہِ راست ریاستی سطح پر اقدام کے متقاضی ہیں۔ ان نکات کا بنیادی مفہوم یہی ہے کہ اگرچہ عوامی شعور، دینی تربیت اور انقلابی نظریہ سازی اہم ہیں، لیکن فیصلہ کن معرکے ریاستی پالیسیوں سے جیتے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم پاکستانی ریاست سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ صرف سفارتی بیانات پر اکتفانہ کرے، بلکہ عملی میدان میں حماس، ایران اور لبنانی مزاحمت کی پشت پر کھڑی ہو۔

تاہم اصل بات یہ ہے کہ صرف عوامی احتجاج یا جذباتی تقاریر سے کچھ نہیں ہو گا جب تک ریاست کی عسکری، سفارتی اور انٹیلی جنس سطح پر واضح اور جرات مند پالیسی نہ ہو۔ یہاں ہمیں ماضی کی تاریخ سے رہنمائی لینی چاہیے۔

جب روس نے افغانستان پر حملہ کیا تو اس وقت پاکستان میں بھی کئی گروہ متذبذب تھے۔ مگر ریاست کے کچھ باشعور عناصر کو یہ بات سمجھ آ گئی کہ روس کا اصل ہدف افغانستان نہیں، بلکہ پاکستان ہے۔ یہی نکتہ اُس وقت ریاست کو باور کروایا گیا، اور یہی نکتہ آج بھی ہم دہرا سکتے ہیں۔ اگر ایران کو تنہا چھوڑ دیا گیا، اگر غزہ میں حماس کی مزاحمت دم توڑ گئی، تو اسرائیل اور اس کے حواریوں کا اگلا ہدف یقیناً پاکستان ہو گا۔ اسرائیل کی نظریاتی دشمنی صرف عرب دنیا تک محدود نہیں؛ وہ ایٹمی پاکستان کو بھی اپنے وجود کے لیے خطرہ سمجھتا ہے۔

لہٰذا پاکستانی ریاست کو صرف "غیر جانب دار" سفارتی پالیسی پر نہیں رہنا چاہیے، بلکہ ایران اور حماس کے ساتھ عسکری تعاون، خفیہ معلومات کا تبادلہ، سرحدی دفاعی حکمت عملی اور اقوامِ متحدہ اور او آئی سی جیسے فورمز پر فیصلہ کن سفارتی مہم چلانی چاہیے۔

یہ جنگ صرف ایران یا فلسطین کی نہیں، یہ جنگ امتِ مسلمہ کے اجتماعی وجود کی بقا کی جنگ

ہے۔ اس میں پاکستان کو اپنا کردار اس فہم و فراست کے ساتھ ادا کرنا ہو گا جو اس نے افغان جہاد کے وقت دکھایا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے جس انداز میں بعض نوجوانوں کے رویوں کو تنقید کا نشانہ بنایا، وہاں "غدار" جیسے الفاظ مناسب نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کا نوجوان، اگرچہ مغربی ثقافتی یلغار کا شکار ہے، لیکن اس کے اندر ایک جذبہ، ایک فطری بیداری موجود ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ان کو مایوسی کی نگاہ سے نہ دیکھیں، بلکہ ان کی توانائی کو اسلام کے عالمی بیانیے کی تشکیل کے لیے استعمال کریں۔

آج مغربی دنیا میں فلسطین کے حق میں مظاہرے کرنے والے ہزاروں نوجوان مسلمان اسی بیداری کا ثبوت ہیں۔ پاکستانی نوجوان بھی اگر فکری رہنمائی، اخلاقی تربیت اور تنظیمی سمت حاصل کریں، تو وہ عالمی سطح پر اسلام دشمن قوتوں کو للکار سکتے ہیں۔ انہیں کیمپسز، یونیورسٹیوں، سوشل میڈیا اور بین الاقوامی پلیٹ فارمز پر فعال کرنا ہو گا۔

یونس قادری بھائی کے تبصرے پر تبصرہ

اپنے تبصرے کے پہلے حصے میں، یونس بھائی نے جو تجاویز پیش کی ہیں ان کے جوہر سے اختلاف کیے بغیر اس بات کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ وہ پاکستانی ریاست کی ماہیت اور اس ریاست سے ہمارا جو تعلق ہے اس کی نوعیت کو شاید اس طرح نہیں سمجھتے جس طرح میں سمجھتا ہوں، اور میرا خیال ہے ڈاکٹر جاوید انصاری صاحب بھی شاید مجھ سے اس بات پر متفق ہوں گے، گو میں یہاں صرف اپنی ذاتی حیثیت میں بات کروں گا۔

ہم بطور اسلامی انقلابی جس ریاست کی بات کرتے ہیں، وہ ریاست موجودہ پاکستانی ریاست کے متوازی معاشرتی سطح پر متبادل اداروں کے قیام اور ان کی قوت کے اضافے کی بنیاد پر وجود میں آئے گی اور بالآخر موجودہ پاکستانی ریاست کو تحلیل کر کے اس کی جگہ لے گی۔

ہمارے ریاست کی سطح پر مثبت کام کا مرکز یہی ریاست ہے۔ اب اس ریاست در ریاستی کام کے دفاع کے لیے اور عمومی اسلامی انقلابی حکمت عملی کے مثبت فروغ کے لیے ہم پاکستانی

ریاست پر دو طرح سے دباؤ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں اور کریں گے۔ ایک دباؤ معاشرتی سطح پر، یعنی ریاست در ریاست کا جو کام ہم کریں گے اس کے دفاع کے لیے دباؤ ڈالیں گے۔ دوسرے دباؤ کو "اقدامی دباؤ" کہہ سکتے ہیں۔ یہ دباؤ حالات وواقعات کے سیاق میں ہو گا، جیسا کہ اس وقت اسرائیل اور ایران کی جنگ کے درمیان تجاویز ہیں۔ اس سطح کے دباؤ کے لیے، جیسا کہ یونس بھائی نے کہا، ہم مختلف حکمت عملیاں اپنا سکتے ہیں اور مختلف آراء (یا تجاویز) مرتب کر سکتے ہیں، مثلاً یہ کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ پاکستانی ریاست کا مفاد بھی یہی ہے کہ وہ ایران کی مدد کرے، مثلاً، فلسطین کی مدد کرے، وغیرہ۔

اس سلسلے میں بھی کئی باتیں ذہن نشین رکھنا ضروری ہے۔ ہمارا یہ دباؤ اتنا ہی مؤثر ہو گا جتنا ہماری معاشرتی قوت بڑھے گی اور جتنا اس معاشرتی قوت کا اظہار پاکستانی ریاستی سیاست کے اندر ہمارے حصے کی صورت میں ابھرے گا۔ یہ سمجھنا کہ پاکستانی ریاست کو ہم بغیر قوت کے محض بیانیے کی سطح پر قائل کر سکیں گے کہ یہ اس کا مفاد ہے، تو اس کی کوشش میں تو کوئی حرج نہیں ہے، لیکن یہ ہے کہ اس میں دو باتیں یاد رکھنی چاہئیں: پاکستانی ریاست ہر ریاست کی طرح اپنے مفاد کو خود سمجھتی ہے، اور افغانستان کی جنگ میں اس نے جو کردار ادا کیا وہ اس اندرونی فہم کا لازمی نتیجہ تھا، اور اسی طرح ایران کے ضمن میں بھی اگر ہماری کافی قوت نہیں ہو گی تو جس چیز سے وہ قائل ہو گی، اس حکمت عملی کے متعلق، وہ ان کا اندرونی فہم ہی ہو گا۔ ہمارا بیرونی دباؤ صرف اسی وقت تک کامیاب ہو سکتا ہے جب ہمارے پاس کافی معاشرتی اور سیاسی قوت ہو۔ اس لیے اس وقت جو کرنے کا کام ہے وہ اس قوت کو جمع کرنے کا کام ہے اور لوگوں کو اسلامی حمیت اور اسلامی اتحاد کی بنیاد پر متحرک کرنے کا کام ہے۔ اس تحرک کی ایک صورت لوگوں کو اس بنیاد پر متحرک کرنا ہو گا کہ پاکستانی ریاست پر دباؤ ڈالا جائے کہ وہ ایران کی عملی مدد کرے وغیرہ۔

جہاں تک امریکہ میں جانے والے پاکستانی نوجوانوں کی بات ہے، میرے خیال میں وہ تجویز امریکہ سے تعلقات کے منقطع کرنے اور اس کا مکمل بائیکاٹ کرنے کے سیاق میں دی گئی

ہے۔ اگر آپ امریکہ کا بائیکاٹ کرنے کے قائل ہیں، اس سے سفارتی تعلقات منقطع کرنے کے لیے حکومت پر دباؤ ڈالیں گے، تجارت ختم کرنے کے لیے دباؤ ڈالیں گے، اس کی مصنوعات کا بائیکاٹ کرنے کے لیے دباؤ ڈالیں گے، تو یہ کس طرح متصور ہو سکتا ہے کہ اس کے باوجود آپ کے جوان مسلسل امریکہ جاتے رہیں اور امریکی ریاست اور اس کے معاشرے کی خدمت کرتے رہیں! یہ تو ایک کھلا تضاد ہے۔

ظاہر ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے جو حکمت عملی تجویز کی ہے وہ ایک عمومی حکمت عملی ہے، متعین افراد کے بارے میں کوئی متعین شرعی حکم نہیں ہے۔ متعین شرعی حکم ہر فرد کے حال کے مطابق ہو گا جو مفتیان کرام بہتر جانتے ہیں، لیکن عمومی حکمت عملی کے لحاظ سے اگر آپ اس کے قائل ہیں کہ امریکہ کا بائیکاٹ ضروری ہے، تو آپ یہ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے نوجوان اس بائیکاٹ کے باوجود امریکہ جاتے رہیں گے وغیرہ۔

احقر العباد

علی محمد رضوی

اسلامی ایران کی عظیم الشان فتح اور پاکستانی اسلامی جماعتوں کی شرم ناک خاموشی

جاوید اکبر انصاری

ایک مرتبہ پھر ایک اسلامی ریاست نے سامراج کو شکست فاش دی ہے۔ آج سامراج اپنے دونوں اہداف حاصل کیے بغیر فرار ہونے پر مجبور ہو گیا۔ ایران پر اسرائیلی / امریکی حملہ آوروں کے دو مقاصد تھے:

۱۔ ایران کی نیوکلیئر استعداد کی مکمل تباہی

۲۔ اسلامی حکومت کا خاتمہ

نیوکلیئر تنصیبات کو نقصان ضرور پہنچا لیکن ناقابل تلافی نقصان نہیں اور ان شاء اللہ بہت جلد ایران اپنے نیوکلیئر پروگرام کو آگے بڑھانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اب واضح ہو گیا ہے کہ نیوکلیئر ہتھیاروں کی تخلیق ایرانی دفاع کے لیے کتنی ضروری ہے اور ان شاء اللہ وہ دن دور نہیں جب ایران پوری طرح نیوکلیئر ہتھیاروں سے لیس ہو کر سامراج کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائے گا۔

جہاں تک حکومت میں تبدیلی کی سامراجی خواہش کا تعلق ہے تو اس کا جواب ان عظیم الشان عوامی مظاہروں نے دیا جو جنگ کے دوران ہر بڑے ایرانی شہر میں اسلامی حکومت کی تائید میں ہوتے رہے۔ ان مظاہروں سے ثابت ہوا کہ ایرانی عوام کی بہت بڑی اکثریت اسلامی حکومت کی پشتیبان ہے۔ ایرانی عوام اور خواص نے ثابت کر دیا کہ وہ بے پناہ جرات کا مظاہرہ کر کے اسلامی نظام کی حفاظت کرتے رہیں گے۔

ایرانی عوام نصف صدی سے دینی نظام کے تحفظ اور فروغ کے لیے عظیم الشان قربانیاں دیتے آئے ہیں اور اس جنگ نے ثابت کر دیا کہ آج بھی ان کا عزم اور استقلال غیر متزلزل

ہے۔ اپنے دور حکومت میں ایرانی علماء نے معاشرتی سطح پر عوامی اصلاح اور تربیت کا جو کام انجام دیا ہے اس نے انقلابی عمل کو معاشرتی پیوستگی عطا کی ہے۔ اس کام کو جتنا سراہا جائے کم ہے اور اس کی نظیر کسی دوسرے ملک میں نہیں ملتی۔

بے شک قابل تقلید ہے اقدام امام کا
جبین لوح غیرت پر لکھا ہے نام امام کا

حالیہ جنگ میں ایران کی فتح محض ایک واقعہ نہیں بلکہ ایک تاریخی مثال ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست ہی وہ ہتھیار ہے جس سے سامراج کو شکست دی جا سکتی ہے۔ اسلامی ریاست کے قیام اور استحکام کی جدوجہد دور حاضر میں غلبۂ دین کا موثر ترین طریقہ ہے۔ اسلامی ریاست ہی کے سبب پہلے افغانستان میں اور پھر ایران میں سامراج کو پسپائی پر مجبور کیا گیا۔ جیسے جیسے دنیا میں اسلامی ریاستیں قائم ہوتی جائیں گی ویسے ویسے سامراجی نظام منتشر ہوتا جائے گا۔ بشرطیکہ یہ ریاستیں انقلابی عمل کو معاشرے میں پیوست کرنے کی حکمت عملی بھی اختیار کریں۔

پاکستانی اسلامی جماعتوں کی شرم ناک خاموشی

پاکستانی اسلامی جماعتوں نے عوام کو ایرانی جہاد کے حق میں متحرک کرنے میں کوئی کردار ادا نہیں کیا۔ شیعہ جماعتوں تک نے نہیں۔ یہ جماعتیں جو پانی اور بجلی اور شہری "حقوق" کی فراہمی کے لیے ہر روز دھرنے دیتی ہیں جنگ کے دوران ایک مظاہرہ نہ کر سکیں جو حکومت پر زور ڈالتا کہ وہ ایران کی عملی مدد کرے۔ ان کے بیانات میں ایران کی حمایت بالکل ناپید تھی اور امریکہ مخالفت بھی نہایت محدود رہی۔ سامراج کے خلاف عملی اقدام کا کوئی ذکر نہ تھا۔ امریکی مصنوعات کے بائیکاٹ کا مطالبہ نہیں کیا گیا اور نہ امریکا سے قومی اور سفارتی تعلقات کے انقطاع کا۔

اس رویے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ پاکستان میں عملاً کوئی اسلامی جماعت موجود نہیں۔ یہ سب جماعتیں جمہوری نظام اور سوشل ڈیموکریسی کی اسیر ہیں۔ جمہوری عمل کے انقلابی استعمال کا

کوئی تصور ان کے پاس موجود نہیں لہٰذا یہ جماعتیں قومی مفاد کے سرمایہ دارانہ تصور کی تصدیق کرتی ہیں اور ریاستی مقتدرہ سے ان کے روابط نہایت گہرے اور وسیع ہیں۔ انقلابی عمل کی معاشرتی پیوستگی کا کوئی تصور ان کے پاس موجود نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ جماعتیں ملک میں اسلامی ریاست کے قیام کی کوئی کوشش نہیں کر رہی ہیں۔ سامراج مخالفت ان کے سیاسی ایجنڈے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ یہ پاکستان کی دہریہ ریاست کو "اسلامی جمہوریہ" کہتی ہیں اور اس کے دستور کے تقدس کی دہائی دیتی رہتی ہیں۔ ایسے میں ان کا دنیا میں جاری اسلامی ریاستوں کے قیام کی جدوجہد سے لاتعلقی کا رویہ ایک فطری عمل ہے۔

یہ نتیجہ پچھلے ۷۵ سال سے سرمایہ دارانہ جمہوری عمل سے توقعات پالنے کا ہے۔ آج پاکستان کی اسلامی جماعتوں کی سیاسی جدوجہد کا ملک میں جاری اصلاحی اور تبلیغی کام سے تعلق بالکل نہیں ہے۔ عوام اسلامی ریاست کے قیام کی ضرورت سے بالکل آگاہ نہیں۔ روایتی جمہوری عمل معاشرے میں سرمایہ دارانہ انفرادیت پیدا کرتا ہے۔ ایران تک میں روایتی جمہوری عمل کو برداشت کیا گیا۔ اس نے بھی اپنے دائرۂ اختیار میں سرمایہ دارانہ انفرادیت پیدا کی جس نے اسلام مخالف غداروں کی ایک کھیپ تیار کی جو ملک میں سامراجی گھس بیٹھیے ثابت ہوئے اور جنہوں نے اسرائیل سے گٹھ جوڑ کرنے سے دریغ نہیں کیا۔ اسلامی ریاست کے استحکام کے لیے ایران میں بھی سرمایہ دارانہ جمہوری نظام کی تطہیر لازم ہے۔ اگر پاکستان کی اسلامی جماعتوں کو اسلامی ریاست اور سامراج مخالفت کا ذریعہ بنانا ہے تو جمہوری عمل کی اسلامی انقلابی تشریح مرتب کرنا لازم ہے۔

ایران کا جوابی حملہ — امت مسلمہ کی غیرت، اسرائیلی خوف اور عالمی توازن کا امتحان

سید محمد یونس قادری
smyounus121@gmail.com

ایران پر حملہ — صرف ایک ملک نہیں، پوری امت کو للکار

ایران نے حالیہ دنوں میں اسرائیل پر براہِ راست حملہ کر کے نہ صرف اپنی عسکری صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے بلکہ پوری دنیا کو یہ باور کرایا ہے کہ وہ خطے میں اپنی خود مختاری اور اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کرے گا۔ یہ حملہ کوئی جذباتی رد عمل نہیں تھا بلکہ ایک بھرپور حکمتِ عملی اور تزویراتی منصوبہ بندی کا نتیجہ تھا جس نے عالمی طاقتوں اور خاص طور پر اسرائیل کو یہ پیغام دیا ہے کہ ایران محض دفاعی نہیں بلکہ جارحانہ جواب دینے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ اس جوابی اقدام کے بعد ایرانی عوام میں غیر معمولی حوصلہ، اتحاد اور ولولہ دیکھنے کو ملا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایرانی قوم اپنی قیادت اور مزاحمتی پالیسی پر مکمل اعتماد رکھتی ہے۔

دوسری جانب، اسرائیل کی داخلی صورت حال کمزور ہوتی دکھائی دے رہی ہے۔ عوام خوف و ہراس کے عالم میں بنکروں میں محصور ہیں اور ایک طویل جنگ کا امکان سیاسی طور پر نیتن یاہو کے لیے خطرے کی گھنٹی بن چکا ہے۔ اندرونِ ملک حزبِ اختلاف نے حکومت کی پالیسیوں پر شدید تنقید شروع کر دی ہے، جس سے اس کی پوزیشن مزید کمزور ہو رہی ہے۔ اگر یہ کشیدگی مزید بڑھی تو یہ نیتن یاہو کی حکومت کے خاتمے کا پیش خیمہ بھی بن سکتی ہے۔

عالمی سطح پر اس کارروائی پر مختلف آراء سامنے آئیں۔ برطانوی تجزیہ نگار رچرڈ کیمپ کے مطابق، ایران نے جو کچھ کیا وہ غیر معمولی اور حیران کن تھا؛ اس نے اسرائیل کو براہِ راست للکارا، جو ایک نیا رخ ہے۔ چیتم ہاؤس کی سینئر تجزیہ کار سنام وکیل نے اسے ایک "طاقتور مگر

حکمت بھرے حملے" سے تعبیر کیا۔ اسی طرح IISS کے فابیان ہنز کا کہنا ہے کہ ایران نے اپنی عسکری قابلیت کو واضح کر دیا ہے اور اسرائیل کے لیے یہ خطرے کی گھنٹی ہے۔ وال اسٹریٹ جرنل کے مطابق ایران کی حکمت عملی صرف میزائلوں تک محدود نہیں، بلکہ اس نے اسرائیل کو داخلی سطح پر بھی عدم استحکام میں مبتلا کر دیا ہے۔

اے دینی جماعتو! اُٹھو، یہ وقت کا تقاضا ہے

ایران کی فلسطین پالیسی ہمیشہ سے اسے امت مسلمہ کے قریب کرتی آئی ہے۔ شام، لبنان اور غزہ میں اس کی معاونت، خاص طور پر حماس اور حزب اللہ کے لیے اس کی پالیسی، سنی دنیا میں بھی اس کے لیے قدر کا باعث بنی ہے۔ اگرچہ بعض عرب ریاستیں اسے فرقہ واریت کی عینک سے دیکھتی ہیں، لیکن اب وقت آ چکا ہے کہ اسلامی دنیا خاص طور پر پاکستان کی دینی و سیاسی جماعتیں فرقہ ورانہ خول سے نکل کر ایران کے ساتھ عملی یکجہتی کا مظاہرہ کریں۔ بڑے جلوس، مظاہرے، اور خطباتِ جمعہ کے ذریعے واضح پیغام دینا ہو گا کہ ایران تنہا نہیں ہے۔ پاکستان کی دینی قیادت کو اس موقع پر ایک ذمہ دارانہ کردار ادا کرنا ہو گا تاکہ حکومتِ وقت پر بھی دباؤ قائم ہو اور امریکہ و اسرائیل کو امت کے اتحاد کا بھرپور پیغام جائے۔

یہ وقت ہے کہ امت مسلمہ ایک نیا بیانیہ قائم کرے — ایسا بیانیہ جو صرف دفاعی نہ ہو بلکہ عزت، غیرت، خود مختاری اور مزاحمت کا پیغام ہو۔ ایران نے پہلا قدم اٹھا کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ اگر کوئی قوم چاہے، تو وہ عالمی طاقتوں کے مقابل ڈٹ کر کھڑی ہو سکتی ہے۔ اب باری دیگر اسلامی ریاستوں اور قیادتوں کی ہے کہ وہ بیداری، اتحاد اور غیرت کا مظاہرہ کریں۔

لبیک یا ایران! لبیک یا اقصیٰ! لبیک یا امت!

This is not just Iran's fight — it is the stand of a civilization. A stand against occupation, arrogance, and hypocrisy.

اسلامی انقلابی تحریکات میں آئیڈیلزم کا اثر

جاوید اکبر انصاری، علی محمد رضوی

ہیگل کا آئیڈیلزم اور جدلیاتی عمل

آئیڈیلزم ایک فلسفہ ہے جسے انیسویں صدی میں ہیگل کے پیروکاروں نے جرمنی میں فروغ دیا۔ اس کا مرکزی خیال یہ ہے کہ ایک مثالی دنیا موجود ہے، جو تمام اعمال اور اقدار کا معیار ہے۔ یہ افلاطون کے اس خیال سے متاثر ہے کہ حقیقت کا ابدی وجود مثالی ہے جس کی عکاسی فکر انسانی کسی نہ کسی حد تک ہر زمانے میں کرتی رہتی ہے اور اس فکر کی روشنی میں انسان اپنی عقل اور خرد کا سہارا لے کر ایسے فرضی خاکوں (ideal types) کو جنم دینے کا مکلف ہوتا ہے جو حقیقت کے اصل ترجمان ہوتے ہیں۔

ہیگل اور اس کے پیروکاروں کا کہنا ہے کہ انسانی تاریخ میں فکر کی یہ صلاحیت وقت کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے۔ قدیم دور میں حقیقت کا تصور غیر واضح تھا، جس میں ترمیم ضروری تھی۔ ہیگل کے مطابق، یہ بہتری جدلیاتی عمل (dialectical process) کے ذریعے ہوتی ہے: پرانے اور نئے خیالات ٹکراتے ہیں، اور اس تصادم سے ایک نیا، زیادہ ترقی یافتہ خیال جنم لیتا ہے۔ یہ عمل انسانی فکر کو تاریخی دھارے میں آگے بڑھاتا رہتا ہے، جسے ہیگل "عقل کی مکاری" (cunning of reason) کہتا ہے۔ یعنی، تاریخ کے بظاہر بے ترتیب واقعات کے پیچھے ایک گہری عقلی منطق کارفرما ہے جو انسانی فکر کو منزل کی طرف لے جا رہی ہے۔

مختصراً، ہیگل اور ان کے پیروکاروں کا کہنا ہے کہ انسانی تاریخ ایک ایسا سفر ہے جس میں انسانی عقل جدلیاتی عمل کے ذریعے بتدریج حقیقت کی طرف بڑھتی ہے، اور اس سفر میں "عقل کی مکاری" ایک اہم قوت کے طور پر کام کرتی ہے۔

ہیگل اور جدیدیت کا عروج

ہیگل جدیدیت کو انسانی فکر کی تاریخ میں ایک سنگ میل سمجھتا ہے۔ اس کے خیال میں، جدید دور میں انسان اپنی عقل (Reason) کے ذریعے حقیقت تک براہ راست رسائی حاصل کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ وہ انیسویں صدی کے اوائل میں، خاص طور پر جرمنی میں، عقل کے اس عمل کو معراج پر پہنچا ہوا دیکھتا ہے، جسے وہ مثالی (Ideal) قرار دیتا ہے۔

ہیگل کا استدلال تھا کہ اس مثالی فکری اور اداراتی فریم ورک کو ایک معیار (Standard) کے طور پر استعمال کیا جانا چاہیے تاکہ تمام سابقہ اور حالیہ تاریخی تجربات کا جائزہ لیا جا سکے اور ان کی قدر کا تعین کیا جا سکے۔ اس کے نزدیک، جو کچھ اس مثالی جرمن ماڈل کے مطابق ہے وہ زیادہ ترقی یافتہ اور عقلی ہے۔ یہ نقطۂ نظر اس کے فلسفۂ تاریخ (Philosophy of History) سے گہرا تعلق رکھتا ہے، جس کے مطابق تاریخ ایک عقلی عمل ہے جو ایک منزل کی طرف بڑھ رہا ہے، اور انیسویں صدی کا جرمنی اس منزل کے قریب ترین تھا۔

مختصراً، ہیگل کے خیال میں جدیدیت نے انسان کو عقل کے ذریعے حقیقت تک رسائی کے ایک نئے دور میں پہنچا دیا ہے اور اس کے نزدیک انیسویں صدی کے اوائل کا جرمنی اس عقلی ارتقاء کا عروج تھا۔ اس لیے وہ اس دور کی مثالی فکر اور اداروں کو تاریخی تجربات کی قدر پیمائی کے لیے ایک معیار کے طور پر دیکھتا تھا۔

مارکس کا مادی نقطۂ نظر اور ہیگل سے اختلاف

مارکس نے ہیگل کے آئیڈیل ازم کو جزوی طور پر رد کرتے ہوئے ایک مختلف نقطۂ نظر پیش کیا۔ ہیگل نے حقیقت کا جوہر خیالات اور شعور میں دیکھا، جبکہ مارکس نے زور دیا کہ حقیقت مادی وجود (material existence) میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس کے مطابق، انسانی شعور اس کے مادی حالات اور سماجی وجود سے متعین ہوتا ہے۔

مارکس جدلیاتی عمل (dialectical process) کا قائل تھا لیکن اس نے ہیگل کے

جدلیاتی طریقۂ کار کو مادے کی سطح پر لاگو کیا۔ مارکس کے خیال میں، انسانی تاریخ کی محرک قوتیں خیالات نہیں بلکہ مادی حالات میں موجود حیاتیاتی نظام (biological systems in material conditions) ہیں۔ یہ نظام اپنی بقا اور ترقی کے لیے جدوجہد کرتے ہیں جس سے سماجی تعلقات اور ادارے وجود میں آتے ہیں۔

مارکس کے نزدیک، انسان اپنی بقا کے لیے مادی دنیا سے تعلق قائم کرتا ہے، اشیا پیدا کرتا ہے، اور اس عمل میں پیداواری قوتیں (productive forces) اور پیداواری تعلقات (relations of production) وجود میں آتے ہیں۔ یہ تعلقات اور قوتیں وقت کے ساتھ بدلتے ہیں اور ان کے درمیان تضاد (contradiction) ہی سماجی ارتقا اور انقلاب کی بنیاد بنتا ہے۔ مارکس نے دعویٰ کیا کہ انسانی فطرت میں جذبۂ نفرت اور حسد (passion for hatred and envy) ایک بنیادی سماجی قوت ہے۔ اس کے مطابق، معاشرے میں ظلم اور استحصال ان جذبات کو ہوا دیتے ہیں، جس سے محکوم طبقہ ظالم طبقے کے خلاف طبقاتی کشمکش (class struggle) پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہی طبقاتی کشمکش تاریخ کی گاڑی کو آگے دھکیلتی ہے۔

مارکس نے سرمایہ دارانہ نظام کے بنیادی تصورات جیسے آزادی، مساوات اور ترقی (freedom, equality and progress) کو رد نہیں کیا، بلکہ اس کا کہنا تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام کے تحت ان کا حصول ایک دھوکہ ہے۔ یہ تصورات سرمایہ دار طبقے کی حکمرانی کو جائز بنانے کے لیے ایک پردہ ہیں، جبکہ حقیقی طبقاتی کشمکش جاری رہتی ہے۔

مارکس نے مغربی تہذیبی تغلب (Western civilizational dominance) کو نامکمل اور ناممکن قرار دیا کیونکہ اس میں پائی جانے والی انفرادیت پرستی (individualism) انسانی فطرت کی صحیح عکاس نہیں ہے۔ اس کے نزدیک، انسان بنیادی طور پر ایک نوعی وجود (species being) ہے، یعنی ایک اجتماعی وجود۔ سرمایہ دارانہ نظام کی انفرادیت پرستی اس فطری اجتماعی وجود سے متصادم ہے۔ مارکس کے مطابق،

سرمایہ دارانہ نظام میں قائم ریاستی اور معاشرتی ترتیبِ اقتدار (state and social order of power) حقیقی آزادی، مساوات اور ترقی کے حصول کو ناممکن بنا دیتی ہے، کیونکہ یہ صرف سرمایہ دار طبقے کے مفادات کو تحفظ دیتی ہے۔

مارکس کا کہنا تھا کہ تاریخ کا سفر اس وقت ختم ہو گا جب نوعی (species being) حقیقی معنوں میں وجود میں آئے گا اور تمام مادی قوتوں (material forces) سے ہم آہنگ ہو کر ان کو اپنے اجتماعی ارادے کے تسلط کا ذریعہ بنا دے گا۔ یہ وہ وقت ہو گا جب تمام انسانی ضروریات اور خواہشات پوری ہوں گی اور ترقی کی راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہے گی۔

مارکس سرمایے کی مسلسل بڑھوتری کی ضرورت کی نفی نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک، سرمایہ دارانہ نظام اپنی فطرت میں مسلسل ترقی اور پیداوار میں اضافے کا متقاضی ہے۔ وہ سرمایہ دارانہ نظاماتی تسلط اور اس کی حقیقت کی تصدیق کرتا ہے، لیکن اس کا ماننا ہے کہ یہ نظام اپنے اندرونی تضادات کی وجہ سے بالآخر ختم ہو جائے گا اور ایک ایسے کمیونسٹ معاشرے کو جنم دے گا جہاں وسائل کی اجتماعی ملکیت ہو گی اور تمام انسان اپنی صلاحیتوں کے مطابق کام کریں گے اور اپنی ضرورت کے مطابق حاصل کریں گے۔

مختصراً، مارکس نے ہیگل کے مثالیت پسندی کو رد کرتے ہوئے تاریخ کی مادی تشریح پیش کی، طبقاتی کشمکش کو تاریخ کی محرک قوت قرار دیا اور سرمایہ دارانہ نظام کے بنیادی تصورات کو کھوکھلا قرار دیا۔ اس کے نزدیک، حقیقی انسانی آزادی اور ترقی اس وقت ممکن ہو گی جب ایک کمیونسٹ معاشرہ قائم ہو گا جو انسانیت کے نوعی وجود ہونے کی فطری حالت سے ہم آہنگ ہو گا۔

مثالیت اور اسلامی انقلابی تحریکات

بیش تر اسلامی انقلابی تحریکات کا ظہور نو آبادیاتی اور سامراجی غلبے کے رد عمل کے طور پر ہوا۔ ان تحریکات نے نہ صرف غیر ملکی تسلط کو چیلنج کیا بلکہ جدیدیت کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا جس کو مغربی طاقتوں کے ذریعے مسلط کیا گیا تھا۔ لیکن یہ تحریکات جدیدیت سے اس کے غلبے

کی وجہ سے جزوی طور پر متاثر بھی ہوئیں۔ اور اس تاثر کی ایک مثال ان کا مثالیت سے متاثر ہونا ہے۔

ان تحریکات نے اسلامی تاریخ کے ماضی اور حال کو جس بنیاد پر جانچا وہ تجریدی (معروضی) اور مثالی تھا۔ ان تحریکات نے اسلامی تاریخ کو اور اس میں ظہور ہونے والی معاشرتی و ریاستی ادارتی صف بندیوں اور علوم کو ان کے عدم مثالی ہونے کی وجہ سے رد کر دیا اور انہی کمزوریوں کو اسلام اور مسلمانوں کے زوال کا سبب قرار دیا۔

ان تحریکات نے اکثر قرون اولیٰ کی ایک مثالی یا آئیڈیل تصویر کو پیش کیا اور اس خیالی تصویر کو اپنا معیار بنایا اور موجودہ پیچیدہ حالات کو اس معیار پر پرکھنے کی کوشش کی، جس کی وجہ سے انہیں زمینی حقائق سے مطابقت پیدا کرنے میں دشواری پیش آئی۔ ماضی کے حالات اور آج کے حالات میں واضح فرق ہے، اور ماضی کے تجربات کو بعینہٖ آج پر لاگو نہیں کیا جا سکتا۔ موجودہ معاشرے اور ریاست، حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ریاست اور معاشرے سے مکمل مشابہت نہیں رکھتے۔ تاریخی ارتقاء، معاشرتی تبدیلیوں اور تہذیبی تغیرات کے باعث بہت کچھ بدل چکا ہے۔

سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ و آلہ سلم نے اس کی تصدیق فرمائی کی کہ تغیر حالات وضروریات کو مد نظر رکھنا چاہیے۔ ہمارے فقہاء نے بھی اس اصول کو اپنایا ہے اور ایسے معاشرتی طریقوں کی تائید کی ہے جو مقامی عادات اور روایات کے مطابق ہوں، جن پر عمل کرنے میں کوئی واضح شرعی قباحت نہ ہو اور جن کے تناظر میں شریعت کے احکامات و مقاصد پر مقامی حالات کے مطابق فطری طور پر عمل پیرا ہوا جاسکے۔ یہ ایک اصولی مگر متحرک اور لچک دار فقہی نقطۂ نظر کی نشان دہی کرتا ہے۔

جیسا کہ امام شاطبی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر علمائے اصول نے فرمایا ہے، اسلامی احکام کے دو پہلو ہوتے ہیں: ایک شریعت کا حکم اور دوسرا صورت حال کا فہم۔ اس لیے ہر شرعی حکم کے فہم میں بنیادی طور پر تین قسم کی غلطیوں کا امکان ہوتا ہے: شرعی حکم کے فہم میں خطا مجرد اعن

فہم الواقع؛ واقعے کے فہم میں خطا مجرد اعن فہم الحکم الشرعی؛ اور تیسرا شرعی حکم کو واقع پر لاگو کرنے میں خطا۔ مگر حکم شرعی کو ان تینوں پہلوؤں میں تقسیم کرنا خود ایک تجرید ہے اور یہ ناممکن ہے کہ ان تینوں پہلوؤں کو حقیقت میں ایک دوسرے سے مکمل طور پر علیحدہ کیا جا سکے۔ ہر جزو کا فہم دوسرے اجزا کے فہم کو کسی نہ کسی حد تک لامحالہ متعین کرے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر صورت حال کا فہم غلط ہو گا تو شریعت کا فہم گو مجرداً صحیح ہی کیوں نہ ہو اس صورتحال کے تناظر میں غلط ہو گا۔

مزید برآں علماء قواعد و اصول نے اس کے تفصیلی احکام بیان فرمائے ہیں کہ کس طرح اور کب حکم شرعی زمان و مکان کے تغیر کے نتیجے میں تبدیل ہوتا ہے اور کب نہیں ہوتا ہے۔ مثلاً جو احکام فہمِ واقعہ پر منحصر ہیں واقعے کے تغیر کے نتیجے میں نئے حکم شرعی کے لیے اس تغیر کا اعتبار لازمی ہوتا ہے وغیرہ۔

ہمارے فقہانے وقت کی اس ضرورت کو معاشرتی عمل سے متعلق احکامات کے بارے میں مد نظر رکھا ہے اور ایسے معاشرتی عمل کی تصدیق فرمائی ہے جو ایسی عادت اور مقامی روایات کے مطابق ہوں جن میں کوئی شرعی قباحت نہ ہو اور جو روح اسلامی سے لگا کھاتے ہوں۔ لیکن علماء اسلامی ریاستی عمل پر ان اصولوں کو لاگو کرنے کی روایت کو بھول گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تقریباً سو سال سے کوئی اسلامی ریاست موجود نہیں تھی تا آنکہ اللہ تعالی نے ہمیں دو اسلامی ریاستیں عطا کیں۔

اسلامی ریاست کے زوال کے دور میں عموماً اور سامراج کے غلبے کے دور میں، جو آج تک جاری ہے، خصوصا، علمائے اسلام نے اسلامی سیاسی احکام پر اصول فقہ اور علم فقہ کی روایات کے مطابق غور و فکر چھوڑ دیا ہے۔ حتیٰ کہ اسلامی فقہ کے سیاسی ابواب اور احکام سلطانیہ کے دروس مدت ہوئی بند ہیں یا کم از کم نایاب ہیں۔ اس لیے آج بعض علماء بھی جب ریاست کی سطح پر بات فرماتے ہیں تو مثالیت کا شکار ہو جاتے ہیں اور نوخیز اسلامی ریاستوں (ایران اور افغانستان) کی پالیسیوں پر حکم لگاتے ہوئے اصولی و فقہی نظائر کو مد نظر نہیں رکھتے اور ان کی

عدم مثالیت کو جواز بنا کر، ان اسلامی ریاستوں کی پالیسوں کو غیر ہمدردانہ نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔

ایران اور افغانستان کی ریاستیں مثالی اسلامی ریاستیں نہیں ہیں۔ وہ سامراج سے گھری اور مقید ریاستیں ہیں۔ حماس اور حزب اللہ بھی دفاعی جہاد لڑ رہی ہیں جس سے پوری اسلامی دنیا نے سہو نظر کر لیا ہے۔ ایسے حالات میں ان سے مثالی پالیسی سازی کی توقع رکھنا دیوانے کا خواب ہے۔

ایران پر بغیر جواز کے کڑی تنقید کی جارہی ہے۔ اس کی ہر ادارتی پیش رفت کو نہ صرف سامراج بلکہ اسلامی انقلابی بھی ناکام قرار دے رہے ہیں۔ یہ دشمن کے ہاتھ مضبوط کرنے کا طریقہ ہے۔ افغانستان کی خواتین کی اعلیٰ تعلیمی نظام سے بے دخلی کی مستقل مخالفت کی جارہی ہے گو کہ اس کا کوئی جواز نہیں۔ بارہ سو سال تک ہم تو کیا عیسائی اور ہندو بھی یہی کرتے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مثالیاتی / آئیڈیل طرز فکر دور حاضر کے غالب تصورات خیر و شر کو اسلامیانے کی ایک کوشش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی بینک کاری اور اسلامی جمہوریت کو فروغ دیا جارہا ہے۔ مثالیت نظری طور پر تو قرون اولیٰ کی طرف پلٹنے کا دعویٰ کرتی ہے لیکن حقیقت میں وہ جدیدیت سے متاثر ہے اور جدیدیت ہی کے خیالات کو اسلامی جواز فراہم کرنے پر منتج ہوتی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ نیت کی خرابی نہیں بلکہ منہج کی خرابی ہے۔

جب آپ کسی بھی چیز کے مثالی خاکے یعنی آئیڈیل ٹائپس متصور کرتے ہیں تو لازماً آپ حقیقت کو تاریخی روایات بشمول علمی روایات اور خاص طور خیالات اور نظریات کی واقعاتی تجسیم سے مجرد کرتے ہیں۔ لیکن مثالی خاکے، مجرد خاکے لازماً کسی نہ کسی سیاق ہی سے معانی پاتے ہیں اور کسی نہ کسی سیاق ہی کے تناظر میں مجسم ہوتے ہیں۔ اس لیے اگر آپ اسلامی علمی تاریخ اور ادارتی تاریخ سے تجرید کریں گے تو لازماً جس چیز سے آپ کے آئیڈیل خاکے یا مثالی خاکے تجسیم پائیں گے وہ آپ کا حاضر و موجود سیاق ہی ہو گا۔ مثالی خاکے خاص طور پر غالب علمی اور ادارتی روایات ہی سے اپنی حقیقی واقعاتی شکل پاتے ہیں۔ اور گو کہ آپ کا دعویٰ

یہ ہے کہ آپ براہ راست قران و سنت سے اپنے مثالی خاکوں کو مرتب کر رہے ہیں لیکن چونکہ وہ خاکے مثالی و تجریدی ہیں اور چونکہ آپ نے اسلامی علمی و تاریخی سیاق کو یا تو رد کر دیا ہے یا نظر انداز کر دیا ہے، اس لیے جس علمی و ادارتی سیاق سے آپ کے مثالی خاکے رنگ پائیں گے وہ آپ کا حاضر و موجود ہی ہو گا۔ اور چونکہ موجود میں جو چیز غالب ہے وہ جدیدیت ہے وہ سرمایہ داری ہے اس لیے آپ کے اسلامی خاکے، اسلامی جمہوریت اور اسلامی بینکاری کے خاکے، جس علم و عمل پر منتج ہوں گے ان کا تعلق رسول پاک کے مبارک دور سے تو دور کی بات، (مثلاً) مغلیہ دور کے علم و عمل و ادارتی صف بندی سے بھی نہیں ہو گا۔

نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ بعض مخلص اسلامی انقلابی اسلامی ریاست کے وجود کی ضرورت سے پہلو تہی کر رہے ہیں۔ درحقیقت ریاست کا وجود معاشرتی وجود کا لازمہ ہے۔ جہاں معاشرہ موجود ہو گا وہاں اس کی اقتداری صف بندی کی تنظیم ناگزیر ہو گی خواہ کتنی ہی ڈھیلی ڈھالی ہو کیوں کہ یہ خیال کہ معاشرتی وجود اقتداری ترتیب کے بغیر قائم رکھا جا سکتا ہے تصوراتی و تاریخی طور پر حقیقت سے عاری ہے۔

یہ خیال انارکسٹ فلسفیوں نے یونان میں سب سے پہلے پیش کیا اور یہ بھی مثالیت کی ایک تعبیر ہے۔ خیال یہ ہے کہ انسان فطرتاً مطلقاً آزاد ہے اس کو کسی ادارتی صف بندی کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص کو اپنی چاہت، اپنی خواہش کو متعین کرنے کا حق فراہم کیا جائے۔

"Do what thou wilt shall be the whole of the Law."

انارکزم کا بنیادی کلمہ خبیثہ ہے۔

انارکسٹ تحریک کا اسلامی تاریخ میں پہلا حملہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے دور میں خوارج کی شکل میں ہوا۔ آپ اپنے پورے دور میں خارجیوں کے خلاف جہاد کرتے رہے جن کا ہدف خلافت کے ریاستی نظام کو منہدم کرنا تھا۔ اور بحمد اللہ آپ کی مساعی جلیلہ کے نتیجے میں اور امام حسین رضی اللہ عنہ کی عظیم الشان قربانیوں کے نتیجے میں اسلامی ریاستی ڈھانچہ آئندہ بارہ سو سال تک قائم رہا۔ اور اس نظام ریاست کو مکمل طور پر تباہ کر کے ہی سامراج ہم پر

غالب آیا ہے۔ آج سامراجی کوشش ہے کہ اسلامی نظام اقتدار کا احیاء نہ ہو۔

تنویری فکری اساس کی بنیاد پر جو ریاستیں قائم کی گئی ہیں وہ خود مختار اور قومی ریاستیں ہیں لیکن نظم اقتدار یعنی ساورینٹی کا قومی ہونا ضروری نہیں۔ ریاست کا نظام ایک مخصوص علاقے میں ایک مخصوص آبادی پر نظام تحکم کا عمل ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ تحکم کسی رائے عامہ کی ساورینٹی sovereignty کا غماز ہو۔ یہ نظام حکم شرع مطہرہ کی تنفیذ کی شکل میں بھی اپنا اظہار کر سکتا ہے اور بارہ سو سال تک کرتا رہا ہے۔ تنویری فکر نے ریاست کے نظام کو جنم نہیں دیا۔ تاریخ انسانی میں پائی جانے والی اس ضرورت کو محض مدقوق کر کے اس کے دائرۂ کار کو معاشرتی سطح پر وسیع کر دیا ہے۔

ان حالات میں مجاہدین اور اسلامی انقلابی ریاست اسلامی کی تعمیر نو کا کام جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان کا کام بے نتیجہ نہیں۔ ان کی پیش رفت سے مایوس ہو جانا سامراج کی طرف داری کرنے کے مترادف ہے۔ قائم شدہ اسلامی ریاستیں (ایران اور افغانستان) مثالی ریاستیں نہیں لیکن وہ اسلامی ریاستیں ہیں۔ وہ پالیسی سازی اور تنظیمی عمل میں غلطیاں کرتی رہیں گی۔ پھر ان پر محدود تنقید تو روا ہے لیکن ان کی اسلام سے وفاداری پر شک کی کوئی گنجائش نہیں رکھنی چاہیے۔ سامراج کی خواہش ہے کہ دنیا بھر میں اسلامی ریاستوں کے قیام کی جدوجہد ختم ہو جائے۔ ہم ایران، افغانستان، فلسطین اور یمن میں جاری جدوجہد کو نظر انداز کر رہے ہیں اور وہاں کے جہاد کو اور دیگر اسلامی ممالک میں جاری اسلامی انقلابی جدوجہد کو نظر انداز کرتے ہوئے سامراجی ریاستی نظام کے انہدامی عمل کو ترک کر رہے ہیں اور اس نامسعود مفروضہ پر ایمان لے آئے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام دائمی ہے جس کی تسخیر ناممکن ہے۔ حقیقت اس کے بالکل برخلاف ہے۔ سامراجی سرمایہ داری ایک تضاداتی نظام اقتدار ہے جو بتدریج منتشر ہو رہا ہے اور نئے مراکز اقتدار ابھر رہے ہیں۔ یہی اسلامی مراکز اقتدار وہ استثنائی اسلامی ریاستیں ہیں جو نظاماتی تبدیلی کے عمل کو آگے بڑھا رہی ہیں۔ ہمیں ان ریاستوں سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ ان کا وفادار ہونا چاہیے۔

ہدایت وارشاد

تصوف در نظر حجت الاسلام امام ابو حامد محمد بن محمد الغزالی رضی اللہ عنہ

غلام جیلانی خان

تمہید

اس وقت مغرب کے جتنے بڑے تھنک ٹینک ہیں ان کا اہم ترین موضوع اسلام ہے۔ ان کی فکر کا جائزہ لیں تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مغرب سیاسی اسلام اور غیر سیاسی اسلام کی ایک دوئی پیدا کر کے اسلامی جدوجہد کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کے نزدیک سیاسی اسلام جہادی اسلام ہے۔ دوسرا صوفی اسلام ہے جو امن و آشتی کا اسلام ہے جو جہادی اسلام سے یکسر مختلف ہے۔ لہٰذا اس ضمن میں تصوف کو فی نفسہٖ (اپنی ذات میں) جاننا ضروری ہے۔ اس ضمن میں اکابر صوفیاء کا تصوف کے سلسلے میں بیان اور ان کا تصوف میں مقام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں حضرت امام غزالی نے تصوف کے متعلق جو کچھ فرمایا ہے وہ پیش خدمت ہے تاکہ مغربی پروپیگنڈے کو سمجھا جا سکے جس کے مطابق اسلام ایک سیاسی مذہب ہے اور اہل تصوف نعوذ باللہ اس کے سب سے بڑے داعی ہیں۔

تصوف حضرت امام غزالی کی نظر میں

حضرت امام غزالی علیہ الرحمہ کا شمار ان اولین اکابرین میں ہوتا ہے جنہوں نے عملی تصوف کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ یونانی سائنس و علوم کا مقابلہ کیا اور فلسفیوں کو جو یونانی سائنس و علوم کے مربی اور داعی تھے بالکلیہ شکست دی اور ان کے طریقۂ کار کو بازیچۂ اطفال ثابت فرما دیا۔ چنانچہ اس کے لیے آپ نے یونانی علوم کی اندرونی تنقید (internal critique) اور بیرونی تنقید (external critique) کے طریقۂ کار کو وضع کیا۔

حجۃ الاسلام امام غزالی طوسی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب منقذ من الضلال میں صوفیاء کرام کے مسلک، ان کے علوم اور ان کے اعمال کے بارے میں فرماتے ہیں کہ:

"جب میں مختلف علوم کی تحصیل اور تحقیق سے فراغت پا چکا تو پھر مجھے یہ خیال ہوا کہ اب میں اپنی تمام تر توجہ کے ساتھ حضرات صوفیائے کرام کے علوم اور مسلک کی طرف متوجہ ہو جاؤں۔"

چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا تو مجھ پر یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ:

* تصوف کا علم نفس کے مکر و فریب کو مکمل طور پر روشن اور واضح کر دیتا ہے۔
* نفس انسانی بری عادات اور ناپسندیدہ صفات سے پاک ہو جاتا ہے۔
* انسانی قلب اللہ کے سوا ہر چیز سے خالی ہو کر ذکرِ الٰہی سے منور ہو جاتا ہے۔
* قابلِ تعریف خوبیاں اور اچھی صفات دلوں کو صاف اور چمکدار بنا دیتی ہیں، جس سے انسانی قلب جمالِ الٰہی کو قبول کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

چنانچہ، میں نے علمائے تصوف کی چند مشہور کتابوں کا مطالعہ شروع کیا، مثلاً حضرت ابو طالب مکی کی "قوت القلوب"، اور اسی طرح حضرت امام محاسبی، حضرت جنید بغدادی، حضرت امام ابو بکر شبلی، حضرت بایزید بسطامی اور دیگر مشائخ کرام کی تصنیفات کا مطالعہ کیا۔ ان کے مطالعے سے علم تصوف اور علم سلوک کی حقیقت معلوم اور مفہوم ہوئی۔ میں نے ان کتابوں کو اس قدر انہماک اور مشغولیت کے ساتھ پڑھا کہ پڑھنے اور سننے سے جتنا کچھ سیکھنا ممکن تھا، سیکھ لیا۔

تاہم، یہ بات بھی میرے ذہن نشین ہوتی چلی گئی کہ تصوف کے نکات اور اس کے اسرار جاننے کے لیے صرف کتابوں کا مطالعہ ہی کافی نہیں، بلکہ اس کے لیے ذوق، وجدان، عادات کی تبدیلی اور حال و قال کی مناسبت ضروری ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک ماہر طبیب (طبیبِ حاذق) ہو مگر وہ خود بیمار ہو۔ اگرچہ اسے سب کچھ معلوم ہے لیکن وہ بیمار ہے اور صرف طبی معلومات سے اس کی صحت یقینی نہیں بنائی جا سکتی۔ اسے اپنے علم کو عملی جامہ

پہنانا پڑے گا تب ہی وہ صحت مند ہو سکے گا، لیکن اس کے بعد بھی یہ ضروری نہیں کہ مریض لازماً صحت یاب ہو جائے گا۔ بسا اوقات لوگ علاج کے بعد بھی صحت یاب نہیں ہوتے۔

چنانچہ مجھے یہ یقین کامل ہو گیا کہ صرف تعلیم اور کتابیں اس راہ کو طے کرنے کے لیے کافی نہیں ہیں۔ قال کو حال بنانے کے لیے ترک لذات، ترک خواہشات ضروری ہے نیز یہ کہ تقویٰ اور پرہیز گاری اختیار کیے بغیر اور حب جاہ اور حب مال کو دل کے گوشوں سے نکالے بغیر قال حال نہیں ہو سکتا جبکہ قال کا حال ہونا بے حد ضروری ہے۔

پس جب اس سلسلہ میں، میں نے اپنے اندر جھانک کر دیکھا تو یہ تمام عیوب اپنے اندر پائے۔ میں اپنی اس کیفیت سے بہت گھبرایا اور حب جاہ، حب مال، حب علائق اور اپنی خواہشات و مرغوبات کو ترک کرنے میں مجھے اس قدر مصائب برداشت کرنے پڑے کہ جن کا بیان تقریباً ناممکن ہے۔ اسی کشمکش کے نتیجے میں میں سخت بیمار پڑ گیا۔

دل و دیں نقد لا ساقی سے گر سودا کیا چاہے
کہ اس بازار میں ساغر متاع دست گرداں ہے

جب میرے طبیبوں اور معالجوں نے میری زندگی سے مایوسی کا علانیہ اظہار کر دیا تو میں نے ایک معذور اور مجبور بندے کی طرح بارگاہ رب العزت میں ہاتھ اٹھا دیے۔ میں نے التجائیں کیں کہ اے میرے آقا اور مولا! مجھ پر اپنا کرم فرما دیجیے، مجھے اس طوفان سے نجات بخش دیجیے اور صحیح سمت میں میری رہنمائی کیجیے۔ آخر کار میری دعائیں اور التجائیں قبول ہوئیں اور میرے دل کا بوجھ ہلکا ہوا۔ تب میں نے فیصلہ کیا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مکہ مکرمہ چلا جاؤں۔

چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا؛ ہر قسم کی مخالفت اور پریشانیوں کے باوجود گھر سے نکل کھڑا ہوا اور ملک شام جا پہنچا۔ وہاں میں گوشہ نشین ہو کر ریاضت اور مجاہدے میں مشغول ہو گیا۔ پھر وہاں سے حج کے لیے روانہ ہو گیا۔ جب مقامات مقدسہ کی زیارت سے فارغ ہوا تو مجھے اپنے اہل و عیال کی یاد آئی۔ اس طرح دس سال کا عرصہ بڑی کسمپرسی میں گزر گیا، لیکن ان خلوتوں اور

گوشہ نشینی میں جو اسرار و نکات مجھ پر منکشف ہوئے، وہ نا قابل بیان ہیں اور نہ ہی انھیں تحریر میں لایا جا سکتا ہے۔

لیکن افادۂ خلق کی خاطر مجاہدوں اور خلوت نشینی کے دوران جو حقیقت مجھ پر منکشف ہوئی، اس کی تفصیل کچھ یوں ہے:

* حضرات صوفیاء کرام رحمۃ اللہ علیہم اجمعین راہِ مولیٰ پر گامزن ہیں اور ان کا طریقِ سلوک بارگاہِ الٰہی تک پہنچاتا ہے۔

* ان حضرات کی سیرت اور عادات سب سے افضل ہیں۔

* ان حضرات کا راستہ باقی تمام راستوں سے زیادہ سیدھا اور صاف ہے۔

* صوفیاء کرام اور درویشوں کے اخلاق و عادات باقی تمام لوگوں سے پاکیزہ تر ہیں۔

الحاصل: فی زمانہ ہمیں دو طرح کے لوگوں اور ان کے فکری، نظری و عملی حملوں کا سامنا ہے۔ ایک وہ جو پکے کافر اور ملحد ہیں، جن کا اوڑھنا بچھونا سرمایہ داری، سیکولرازم اور لبرل ازم ہے۔ دوسرے وہ ہیں جو مسلمان تو ہیں، لیکن عملی دنیا میں آج کے مغرب اور اس کی فکر سے آلودہ تر ہو چکے ہیں۔ چنانچہ ہر دو سے نبرد آزما ہونے اور فکری و عملی جہاد کے لیے حضرت امام غزالی قدس سرہ کا مرتب کردہ لائحہ عمل ہمارے لیے چراغِ راہ ہے۔ حضرت امام غزالی علیہ الرحمۃ کے مرتب کردہ فکر و عمل کے نتیجے میں جہادی اسلام اور صوفی اسلام کی تقسیم باقی نہیں رہتی۔ وما توفیقی الا باللہ۔

نظریات و تطبیقات

جہادِ افغانستان اور احیائے ریاستِ اسلامی

ڈاکٹر جاوید انصاری

نوٹ: یہ مضمون امریکی شکست وبے دخلی کے بعد لیکن امارات اسلامیہ ثانیہ افغانستان کے قیام اور مکمل فتح سے قبل لکھا گیا تھا۔

ریاست کیا ہے؟

ریاست اس نظمِ اطاعت کو کہتے ہیں جو فرد اور معاشرہ پر جبراً نافذ کیا جاتا ہے۔ یہ نظمِ اطاعت خاندانی نظام کے برعکس فطری نہیں ہوتا۔ ریاست فرد یا معاشرتی اداروں کو اس نظمِ اطاعت سے خروج کی اجازت نہیں دیتی۔

نظاماتی اطاعتی جبر کو تاریخ انسانی میں تین بنیادوں پر جواز فراہم کیا گیا ہے۔ ایک جواز معاشرتی روایات ہیں کہ ایک معاشرہ میں زمانہ قدیم سے جبری اطاعت کا یہ مخصوص طریقہ رائج رہا ہے۔ اس جواز کی بنیاد پر بادشاہی نظمِ ریاست قائم رہتے ہیں۔

دوسرا جواز عوام کی نفسانی خواہشات کی پیروی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جو نظام اطاعت جبراً قائم کیا گیا ہے وہ عوام کی نفسانی خواہشات کی تکمیل کو ممکن بناتا ہے اور اس طرح یہ جبر عوام بالواسطہ خود اپنے اوپر مسلط کرتے ہیں۔ یہ جمہوریتوں کا تحکمی جوازی نظریہ ہے۔

تیسرا جواز ان شریعتوں کی پیروی کا دعویٰ ہے جو انبیاء علیہ السلام پر وحی کی گئیں۔ یہاں جبری اطاعت کی تنفیذ کا مقصد حصول رضائے الٰہی ہے۔ اس کی تکمیلی شکل اسلامی ریاست ہے۔ انقلاب امریکا (۱۷۷۶ء)، انقلاب فرانس (۱۷۸۹ء) اور کمیونسٹ انقلاب (۱۹۱۷ء) سے قبل عیسائی ریاستوں نے بھی اس جواز کو جزواً پیش کیا تھا۔

نفاذاتی نظاماتی جبر کو کارفرما رکھنے کے دو بنیادی ذرائع ہیں: قانون اور انتظامیہ۔ جمہوریتوں میں قانون کی تشکیل و تشریح مقننہ اور عدلیہ، اور ایڈمنسٹریشن (انتظامیہ) کی تشریح نوکر شاہی، فوج اور سول انتظامیہ (پولیس، نظم محصولات وغیرہ) کرتی ہیں۔ غیر جمہوری نظاموں میں

بھی مقننہ کے علاوہ یہ تمام ادارے (عدلیہ، فوج، سول انتظامیہ، محصولاتی نظم وغیرہ) موجود رہے ہیں۔

انسانیت کی معلوم تاریخ میں ریاست کا وجود دائمی رہا ہے لیکن اس کے دائرۂ کار کی وسعت تبدیل ہوتی رہی ہے۔ قرون وسطیٰ میں یورپی ریاستوں کا دائرۂ اختیار نسبتاً بہت محدود اور حالیہ کمیونسٹ چین کی ریاست کا دائرۂ کار نہایت وسیع ہے لیکن دونوں جگہ نظاماتی جبر ریاستی اداروں (عدلیہ، انتظامیہ، فوج وغیرہ) کے ذریعے نافذ کیا جاتا رہا ہے۔

انسانی اجتماعیت کو برقرار رکھنے کے لیے ریاست کا وجود ناگزیر ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے میں ایک نظمِ قانون، عدلیہ، انتظامیہ اور فوج قائم فرمائی اور مکے کے دور میں مسلمانوں میں جو اختیاری معاشرتی اطاعتی نظام تھا اس کو شرعی نظمِ اطاعت سے تبدیل کر دیا۔

ہمیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ حضور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن خطوط پر ریاستی ادارے (عدلیہ، انتظامیہ، فوج) مرتب فرمائے تھے، اسلام کی بارہ سو سالہ تاریخ میں یعنی سامراج کے غلبے تک، انہی اصولوں کے مطابق ریاستی نظام مرتب رہا۔ اس کی روشن مثالیں سلطنتِ مغلیہ، سلطنت عثمانیہ اور سلطان سولو کی قائم کردہ سلطنت فراہم کرتی ہیں۔

جب ہم اسلامی انقلابی اسلامی ریاست کے احیاء کی جدوجہد کرتے ہیں تو ہمارا مقصد تمام ریاستی اداروں (عدلیہ، انتظامیہ، سول ایڈمنسٹریشن، نظم محصولات) اور ان ریاستی اداروں کو جو سرمایہ دارانہ دور سے مخصوص ہیں، یعنی مارکیٹی ادارے (کارپوریشن وغیرہ) اور میڈیا، کی ان خطوط پر ترتیب نو کی کوشش ہے جو تاریخ اسلامی میں معتبر اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نافذ کردہ اصولوں کے مطابق ہوں۔ اسلامی حکومت کا قیام محض اس ہمہ گیر ریاستی اداراتی انقلاب کا ایک ناگزیر ذریعہ ہے۔

سرمایہ دارانہ ریاست

آج ہم پر سامراج نے سرمایہ دارانہ ریاست کا جبری تسلط قائم کیا ہے۔ سرمایہ داری ایک ایسا مکمل نظام زندگی اور طرز حیات ہے جس کو سرمایہ دارانہ ریاست غیر سرمایہ دارانہ انفرادیت اور معاشرت کے فروغ کے ذریعے مسلم ممالک پر مسلط کر رہی ہے۔ سرمایہ دارانہ ریاست کا وجہ وجود سرمایہ دارانہ انفرادیت اور سرمایہ دارانہ معاشرت کی عمومیت ہے۔

سرمایہ دارانہ انفرادیت اس انفرادیت کو کہتے ہیں جس پر نفسِ امارہ کے احکامات کی تابع داری نافذ ہو اور جو حرص اور حسد سے مغلوب ہو اور جو دنیا میں جنت بنانے کی سعیِ لاحاصل میں ہمہ وقت مشغول ہو۔

سرمایہ دارانہ معاشرت اس معاشرت کو کہتے ہیں جہاں جاہلی عقلیت قدر کا پیمانہ بڑھوتریٔ سرمایہ کو قرار دیتی ہے یعنی کسی عمل کی قدر کا تعین اس امر کی بنیاد پر کیا جائے گا کہ اس سے بڑھوتریٔ سرمایہ میں کتنا اضافہ ہوتا ہے۔ یہ مارکیٹ کی کارفرمائی کا اصل الاصول ہے۔ سرمایہ دارانہ ریاستی ادارے تمام کے تمام اس ہی جاہلی عقلیت کو مرتب اور نافذ کرنے کی غرض سے مستقلاً کارفرما رہتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام میں ریاستی تحکم کا مطلب تحکم قانون سرمایہ کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ تمام ریاستی ادارے (عدلیہ، انتظامیہ، فوج، سول ایڈمنسٹریشن، کارپوریشن، میڈیا) اس ہی تحکم قانونِ سرمایہ کے لیے کارفرما رہتے ہیں۔

تحکم قانونِ سرمایہ کو انفرادیت اور معاشرت پر مسلط کرنے کے لیے روایتی ریاستی اداروں (عدلیہ، مقننہ، فوج، انتظامیہ) کے ذریعے ہر فرد کو سرمایہ دارانہ نظمِ ملکیت کا تابع بنایا جاتا ہے۔ حرام خور (فنانشل) مارکیٹوں کی کارفرمائی حلال رزق کے حصول کو مشکل سے مشکل بنا دیتی ہے۔ میڈیا مستقل حرص و حسد کے فروغ کی ریشنل (جاہلی عقلی) ناگزیریت کا درس دیتا ہے۔

سرمایہ دارانہ ریاستی نظام کے خلاف اسلامی انقلابی جدوجہد

ہم پر سرمایہ دارانہ ریاستی نظام سامراج نے انیسویں صدی میں مسلط کیا۔ بیسویں صدی میں حصولِ آزادی کے بعد اسلامی دنیا میں بیش تر ریاستیں سرمایہ دارانہ خطوط پر ہی مرتب کی گئیں۔ ہماری مقننہ، عدلیہ، انتظامیہ، سول ایڈمنسٹریشن، پولیس، مارکیٹ اور میڈیا سب کی سب کو سامراج نے سرمایہ دارانہ خطوط پر مرتب کیا ہے۔ ایران اور چند مفتوحہ علاقوں کے علاوہ تمام مسلمان ریاستیں اِنہی سرمایہ دارانہ خطوط پر قائم اور کار فرما رہی ہیں۔

پاکستان میں مخلصینِ دین کو اسلامی دستوریت کا دھوکہ ضرور دیا گیا اور وہ اس دھوکہ میں رہنے پر آج تک اصرار کرتے ہیں لیکن تمام ریاستی ادارے (مقننہ، عدلیہ، انتظامیہ، فوج، پولیس، میڈیا) سرمایہ دارانہ سامراجی خطوط پر مرتب کیے گئے ہیں اور ہمارے روایتی ریاستی نظام یعنی مغل سلطنت کی روح اور ساختی شکل سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ریاستی پالیسی کا مقصد ہمیشہ تحکمِ قانون سرمایہ ہی رہا ہے۔

پاکستان میں ہم اسلامی انقلابی جدوجہد اس ہی ریاستی تناظر میں مرتب کرنے پر مجبور ہیں اور یہ مجبوری دیگر مسلم ممالک کی اسلامی تحریکات کو بھی درپیش ہے۔ لیکن دو ممالک ایسے ہیں جہاں اس مجبوری کو چیلنج کیا جا رہا ہے۔ ایران میں اسلامی انقلاب کے وقوع کے بعد ریاستی ادارے کسی نہ کسی حد تک سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے فتاویٰ کی روشنی اور صفوی سلطنت کی روایات کے مطابق مرتب کیے جا رہے ہیں اور جمہوری نظام کو جزوی طور پر شریعتِ مطہرہ کے تابع کر لیا گیا ہے۔ لیکن ایران پر سامراجی دباؤ بڑھتا جا رہا ہے اور سامراج اس بات کی بھرپور کوشش کر رہا ہے کہ انقلابِ اسلامی کو شکست دے دی جائے۔

جہاد افغانستان کی انفرادیت

جہاد افغانستان حالیہ تاریخ اسلامی کا انوکھا واقعہ ہے۔ یہ پہلی مرتبہ ہوا ہے کہ کسی ملک میں اسلامی افواج نے سامراج کو عسکری شکست دی اور پسپا ہونے پر مجبور کیا ہے۔ اس سے پہلے

دورِ حاضر میں ہم یہ کہیں بھی نہ کر سکے نہ چیچنیا میں، نہ صومالیہ میں، نہ شام میں، نہ عراق میں، نہ لیبیا میں۔ ہر جگہ ہماری فتوحات وقتی ثابت ہوئیں اور دشمن اور ان کے غدار آلۂ کار جلد ہی غالب آ گئے۔

افغانستان میں طالبانِ عالیشان نے روس اور امریکا کو جامع اور ہمہ گیر شکست دی ہے اور توقع کی جاسکتی ہے کہ کچھ بھی ہو جائے امریکا (روس یا چین یا بھارت) افغانستان میں نئی فوج کشی کی جرأت نہیں کر سکتا۔ لہٰذا طالبان کو یہ موقع حاصل ہے کہ وہ محض اسلامی حکومت کے قیام پر اکتفانہ کریں بلکہ اسلامی ریاست کے ہمہ گیر احیاء کی جدوجہد کریں اور تمام ریاستی ادارے شرع مطہرہ اور اسلامی تاریخی روایات کے اصولوں کے مطابق مرتب فرمائیں اور ان کے مطابق کار فرمائی فرمائیں۔

طالبانِ عالیشان ۱۹۹۶ تا ۲۰۰۱ اس کا تجربہ کر چکے ہیں اور اس دور میں ان کی ملکی سطح پر قائم کردہ انتظامیہ، عدلیہ، فوج اور نظمِ ملکیت اصولِ سیاستِ اسلامیہ کا مظہر تھے۔ افغانستان میں محض اسلامی حکومت قائم نہیں تھی بلکہ وہاں ایک اسلامی ریاست بھی قائم تھی۔ اس ریاست کو امارت اسلامیہ کہتے تھے۔

ریاستِ اسلامیہ کا مطلب ہے سرمایہ دارانہ ریاستی نظام، اس کی مقننہ، انتظامیہ، فوج، مارکیٹوں، عدلیہ اور میڈیا کا انہدام۔ یہ غداروں کی پٹھو حکومت سے کسی مصالحت کے ذریعہ ناممکن ہے۔ یہ جہاد اس وقت تک جاری رہنا چاہیے جب تک سامراج کا وضع کردہ سرمایہ دارانہ نظامِ ریاست کلیتاً منتشر نہ ہو جائے۔ غداروں کی فوج ہتھیار نہ ڈال دے اور امارتِ اسلامیہ پورے ملک میں اپنا اقتدار نہ قائم کر لے۔

پاکستان سامراج کے آلۂ کار کی حیثیت سے طالبان پر زور ڈال رہا ہے کہ وہ غدار حکومت سے مصالحت کر لیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان خود ایک سرمایہ دارانہ ریاست ہے اور اپنے پڑوس میں سرمایہ دارانہ ریاست کے انہدام کو اپنے لیے خطرہ تصور کرتا ہے۔ عمران خان کی تکرار ہے کہ افغانستان میں جمہوری نظام کا تسلسل قائم رہے اور فیصلہ عوام کی رائے پر منحصر

ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ پچھلے بیس سال میں افغان حکومت نے سرمایہ دارانہ انفرادیت اور معاشرت کو فروغ دینے کی بھرپور کوشش کی ہے اور عوام کو گمراہ کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی ہے۔ حرام خوری، فحاشی، سرمایہ دارانہ حقوق کی طلب، لہو ولعب کو فروغ دیا ہے۔ عوام کی اخلاقی اور روحانی حالت نہایت دگرگوں ہے۔ ایسے میں ان کی اکثریت سے یہ توقع رکھنا کہ وہ شرعی نظام اطاعت کو قبول کر لیں گے ایک دیوانے کا خواب ہے۔ انہیں ایک مدت دراز تک شرعی احکامات کو قبول کرنے پر مجبور کیے جانے کی ضرورت ہے۔

پھر منصفانہ انتخابات کا انعقاد افغانستان میں کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ منصفانہ انتخابات تو اب امریکا تک میں نہیں ہوتے جہاں کے رائے دہندگان کا ۴۲ فیصد حصہ یہ سمجھ رہا ہے کہ ۲۰۲۰ء میں بائیڈن انتخابی دھاندلیوں کے سبب صدر بن بیٹھا ہے۔

افغانستان میں انتخابی عمل سامراجی تخریب کاری کو فروغ دینے کے وسیلے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ یہ بات برادر بزرگ محترم مجاہد رہنما گلبدین حکمت یار کو سمجھانے کی اشد ضرورت ہے۔ جو قوتیں غدار حکومت سے مصالحت پر زور دیتی ہیں ان کا مقصد یہ ہے کہ طالبان عالیشان نے جو جنگ میدان کارزار میں جیتی ہے وہ اس کو مصالحت کے ذریعہ ہارنے پر راضی ہو جائیں۔ لہٰذا اسلامی انقلابیوں کو افغانستان میں جاری جہادی عمل کے تسلسل کی بھرپور حمایت کرنی چاہیے۔

ہم اسلامی ایران سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ اس نازک موقعہ پر اپنے افغان بھائیوں کو اکیلا نہ چھوڑیں اور تسلسلِ جہاد کی اہمیت اور ضرورت کا احساس کریں۔ مصالحت کے جھانسے میں نہ پھنسیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایرانی اسلامی ریاست کی پشت پناہی کے لیے افغانستان میں امارت اسلامیہ کا قیام واستحکام نہایت ضروری ہے۔ ورنہ ایک جمہوری دہریہ افغانستان بہت جلد ایک ایسے سامراجی بیس کیمپ میں تبدیل ہو جائے گا جو ایران پر حملہ آور ہونے کے لیے استعمال کیا جائے گا۔

لبرل سرمایہ دارانہ ریاست کی حقیقت اور ماہیت

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

دور حاضر میں جو ریاستی نظم دنیا پر مسلط ہے وہ سرمایہ دارانہ نظم اقتدار ہے اور اس کے استحکام اور توسیع سے اسلامی انفرادیت، معاشرت اور ریاست شدید خطرات سے دوچار ہے کیونکہ سرمایہ دارانہ اقتدار کی موجودگی میں مذہبی اقدار کا تادیر قائم رکھنا نہایت مشکل امر ہے۔ مغرب میں عیسائی اقدار کی تباہی اس کا واضح تاریخی ثبوت ہے۔ نفس مضمون (یعنی سرمایہ دارانہ ریاست کی حقیقت وماہیت) بیان کرنے سے قبل ہم چند اصولی تمہیدی نکات پیش کرنا چاہتے ہیں جن سے ریاستی معاملات پر انقلابی نقطۂ نظر اختیار کرنے کی اہمیت واضح ہوگی۔

اولاً: خلافت یعنی شریعت محمدی ﷺ کی پابند ریاست کے قیام کے بغیر نہ تو اسلام کو قوت اور غلبہ حاصل ہو سکتا ہے اور نہ ہی طاغوتی نظام کا خاتمہ ممکن ہے۔ شریعت کا مسلمہ اصول ہے کہ واجب کا مقدمہ بھی واجب ہوتا ہے لہٰذا ریاست اسلامیہ کے قیام کے لیے جو ذرائع ناگزیر ہیں ان کے حصول کی کوشش کرنا مسلمانوں پر واجب ہے۔

ثانیاً: ۱۸۵۷ء کے جہاد میں ناکامی اور خلافت عثمانیہ کے سقوط کے بعد سے لے کر اب تک سرمایہ دارانہ استعمار کے جواب میں احیائے اسلام کے لیے بے شمار تحریکات برپا ہوئیں جن کے کام کو تقسیم کار کے اعتبار سے چار سطحوں پر رکھا جا سکتا ہے۔

۱. مدرسین اور مزکین ___ ان کا بنیادی ہدف اسلامی علوم کا تحفظ اور اسلامی انفرادیت و تشخص کا فروغ ہے۔ ان کے بنیادی ادارے مسجد، مدرسہ اور خانقاہ ہیں۔

۲. مبلغین اور مصلحین ___ ان کا بنیادی مقصد اسلامی معاشرت کا استحکام و فروغ ہے اور وہ دینی تہذیبی روایات کے تحفظ و فروغ اور حلال کاروبار کے پھیلاؤ میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ اس ضمن میں سب سے نمایاں کام تبلیغی جماعت اور دعوت اسلامی کا ہے جو صحیح معنوں میں عوامی اسلامی تحریکات ہیں۔

۳. انقلابی ___ ان کا نقطۂ ماسکہ ریاست کا اسلامی نہج پر اصلاح و قیام ہے اور یہ رائج شدہ نظام زندگی میں مکمل تبدیلی کے خواہاں ہیں۔

۴. مجاہدین ___ ان کا مرکزی نکتہ بھی تعمیر وغلبۂ اسلامی ریاست ہے اور یہ استعمار اور اس کے ایجنٹوں سے عسکری سطح پر برسرپیکار ہیں اور طاغوتی طاقتوں کے پھیلاؤ کے مدمقابل مزاحمت پیدا کر کے اسلامی ریاستوں کے قیام کے مواقع فراہم کر رہے ہیں۔ اس کی سب سے واضح مثال طالبان عالیشان ہیں۔

اول الذکر دو تحریکات دفاع امت جبکہ موخر الذکر دونوں غلبۂ دین کی تحریکات ہیں۔ یہ تمام راسخ العقیدہ دینی گروہ پورے اخلاص کے ساتھ اپنے اپنے کام میں ہمہ تن مصروف ہیں البتہ ان کے کاموں میں ایک بنیادی کمزوری یہ ہے کہ ان کے کام اس معنی میں جدا جدا ہو گئے ہیں کہ تطہیر نفس اور اصلاح معاشرے کا کام علماء وصوفیاء اور وہ جماعتیں کر رہی ہیں جو تعمیر ریاست کے کام سے لاتعلق ہیں۔ اسی طرح تعمیر ریاست اور جہاد کا کام وہ جماعتیں کر رہی ہیں جن کے پاس بالعموم تطہیر قلب کا کوئی واضح ضابطہ موجود نہیں ہے، نتیجتاً تطہیر قلب کا کام محض تبلیغ و تطہیر اور ریاست کا کام محض قتال یا جمہوری عمل بن کر رہ گیا ہے۔ تقریباً ہر اسلامی گروہ اور جماعت اپنے کام کو دوسرے اسلامی گروہ کے کام کا متبادل (substitute) اور اس سے اعلیٰ و ارفع سمجھتی ہے جبکہ حقیقتاً ان کے درمیان تعلق ایک دوسرے کے تکملے (complementarity) کا ہے اور ان چاروں میں سے کسی دینی کام کو دوسرے دینی کام پر کوئی اقداری فوقیت حاصل نہیں۔ اصل ضرورت کسی نئے دینی کام کو شروع کرنے یا ایک دینی کام کو چھوڑ کر کسی دوسری دینی جماعت میں ضم ہو جانے یا کوئی ایسی نئی دینی جماعت بنانے کی نہیں جو سب کام کرے کیونکہ الحمد للہ مختلف انفرادی دینی جماعتوں کا کام مل کر مطلوبہ مجموعی دینی کام کی کفایت کرتا ہے۔ اصل ضرورت موجودہ دینی تحریکات کے کام میں ارتباط پیدا کرنے کی ہے۔ ہر دینی گروہ اس بات کو لازم پکڑے کہ اپنے کارکنان کو دوسری دینی تحریکات کا قدردان بنائے اور ان کے ساتھ اشتراک عمل کرنے پر رغبت دلائے۔ جب

تک اسلامی گروہوں میں اشتراک عمل کا یہ طرز فکر عام نہ ہو گا، دوسرے گروہ کے دینی کام کو برابر اہمیت نہ دی جائے گی اور مجموعی کام کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط نہیں کیا جائے گا، انقلابی جدوجہد کا سہ جہتی کام ادھورا ہی رہے گا۔

کہو ہر کارکن سے سب جتھوں کو اپنا گھر سمجھے
ہر ایک بھائی کو اپنا حلیف و ہم سفر سمجھے

مولانا معین الدین خٹک

ثالثاً: ان تحریکات کی جدوجہد بالعموم سرمایہ دارانہ نظام کے اندر رہتے ہوئے مرتب ہوتی ہے اور ان کے پاس ریاست کے اندر ریاست (state within the state) قائم کرنے کا کوئی لائحۂ عمل موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اتنے بڑے پیمانے پر جاری وساری کام کے باوجود اسلامی قوت یکجا نہیں ہو رہی اور ان غیر مجتمع انفرادی دینی کاموں کے نتیجے میں غلبۂ دین کے امکانات سامنے نہیں آتے اور نہ ہی تحفظ دین کا کام کماحقہ ہو پاتا ہے کیونکہ ہم ہمیشہ دفاع اور رد عمل کی سطح ہی پر رہتے ہیں۔

موجودہ ریاستی ڈھانچے کے حوالے سے اسلامی تحریکات کے رویوں میں دو طرح کی خامیاں ہیں، ایک وہ جو تحفظ امت کی تحریکات کو لاحق ہیں اور دوم وہ جن کا شکار غلبۂ دین کی تحریکات ہیں:

(الف) اصلاح انفرادیت و معاشرہ کی تحریکات اصولاً تحفظ اسلام کی تحریکات ہیں جن کا مقصد سرمایہ دارانہ نظم اجتماعی کے اندر ایک ایسے دائرے کی تلاش رہی ہے جہاں اسلامیت کی حفاظت و بقا ممکن ہو سکے۔ ان تحریکات نے اس مفروضے کی بنیاد پر خود کو ریاستی معاملات سے علیحدہ رکھا ہے کہ نظام اقتدار سے غیر جانبداری کا رویہ ممکن ہے جبکہ یہ مفروضہ درست نہیں، ریاست سے غیر جانبداری ناممکن الوقوع شے ہے کیونکہ ریاست تو بالفعل "موجود ہے" اور وہ احکام کے صدور کے ذریعے فرد اور معاشرے پر اثر انداز ہوتی رہتی ہے چنانچہ اقتدار کے معاملے میں لاتعلقی یا غیر جانبدار رویے کی کوئی حقیقت نہیں یا تو آپ کسی نظام

اقتدار کے خلاف ہوتے ہیں یا اس کے حق میں ان کے درمیان کوئی راستہ موجود نہیں۔ ہماری سب سے بڑی عوامی تحریکات یعنی دعوت اسلامی اور تبلیغی جماعت ریاستی مسائل سے نہ صرف یہ کہ صرف نظر کرتی ہیں بلکہ انہیں گندگی سمجھتی ہیں۔ یہ جماعتیں اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ غیر سیاسی جماعتیں ہیں حالانکہ ان کی اس بات کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ انہوں نے باطل نظام اقتدار سے مصالحت قبول کر لی ہے۔ اقتدار سے لاتعلقی کے امکان کی اس غلط فہمی کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلام پر عمل کرنے کا دائرہ دن بہ دن چھوٹا ہوتا چلا جا رہا ہے اور سرمایہ داری پر مبنی نظام اقتدار ہم پر غالب آتا جا رہا ہے۔ کسی منکر کو ہوتے دیکھ کر خاموش رہنے کا مطلب یہ نہیں کہ آپ منکر کے معاملے میں غیر جانبدار ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس کی بالادستی قبول کرتے ہیں اور منکر کے ساتھ یہ مفاہمت اس کی تقویت اور فروغ کا باعث بنتی ہے۔ لہٰذا اقتدار (نہ کہ محض حکومت) اور غلبے کے مسئلے پر تمام دینی کام کو مربوط کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ اگر یہ نہ کیا گیا تو انفرادی اصلاح تو ہو جائے گی لیکن اس کے نتیجے میں کافر اقتدار کو نقصان نہیں پہنچے گا اور بالآخر اصلاح نفوس بھی مشکل ہوتی چلی جائے گی کیونکہ اصلاح کتنی ممکن ہے اس کا انحصار واقعیتی (factual) معاشرتی و ریاستی جکڑ بندیوں پر ہوتا ہے جن سے ایک فرد دوچار ہوتا ہے۔ اسلامی انفرادیت کے فروغ کے لیے ایسی ترتیب اقتدار چاہیے جو واقعیت کو بدل دے اور اسلامی انفرادیت کی راہ میں حائل رکاوٹیں دور کر دے۔ مصلحانہ جدوجہد کرنے والی تحریکات کا یہ مفروضہ غلط ہے کہ اسلامی انفرادیت کا سیاسی اظہار اور ترتیب اقتدار خود بہ خود رونما ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے جب اسلامی علمیت کے تحفظ کے لیے شعوری طور پر ادارتی صف بندی عمل میں لانا لازم ہے، محض افراد کو اس کی اہمیت بتلا دینے سے کام نہیں چلتا تو اسلامی اقتدار کے قیام کیلئے مطلوبہ صف بندی سے صرف نظر کیسے کیا جا سکتا ہے اور اس کا ظہور خود بہ خود کیسے ہو جائے گا؟ افسوس کی بات ہے کہ ہمارے مدارس میں بھی ریاست و سلطنت کی نظریاتی بحثیں بالکل معدوم ہو گئی ہیں اور متقدمین میں سے کسی مسلم سیاسی مفکر کی کوئی کتاب ہمارے درس نظامی میں شامل

نہیں۔

(ب) انقلابیوں کا اصل کام یہی ہے کہ وہ سارے دینی کام کو اس طرح مجتمع کریں کہ اسلامی اقتدار قائم ہو سکے مگر جن تحریکات نے غلبۂ دین کو اپنی جدوجہد کا بنیادی مرکز بنایا انہوں نے یا تو انقلاب کو جمہوری سیاست کا ہم معنی سمجھ لیا یا پھر احتجاجی و مطالباتی سیاست کو۔ یاد رہنا چاہیے کہ ہماری جدوجہد کا مقصد موجودہ نظام اقتدار کے اندر شمولیت نہیں بلکہ ایک متبادل نظام زندگی اور اقتدار قائم کرنا ہے جہاں عوام یا کسی فرد کے بجائے "اہل الرائے" کا اقتدار قائم ہو جن کی مرضی و مشورے سے ہی ریاست کے امور طے پائیں، جن تحریکات نے جمہوری سیاست کو اصل مقصود بنا رکھا ہے انہیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ریاست کے اندر ریاست (state within the state) کے قیام کی جدوجہد کے بغیر ریاست نہیں بلکہ حکومتیں تبدیل ہوا کرتی ہیں کیونکہ قانون کے اندر رہ کر کی جانے والی جدوجہد تو loyal disobedience (تابع دارانہ مخلص نافرمانی) ہوتی ہے جس کے نتیجے میں نظام اقتدار تبدیل نہیں ہوتے۔ نظام باطل کے قانونی دائرے میں رہتے ہوئے اقتدار تبدیل کرنے کی خواہش رکھنا self-defeating (تضاد پر مبنی) اصول ہے کیونکہ ہر نظام اقتدار کے قوانین اس کے اپنے استحکام کے لیے بنائے جاتے ہیں نہ کہ اسے ڈھا دینے کے لیے۔ تابع دارانہ نافرمانی کے ذریعے اقتدار تبدیل کرنے کی غلط فہمی اس لیے پیدا ہوئی کہ ہم نے قانون کو "غیر اقداری" (value-neutral) سمجھ لیا ہے حالانکہ ہر قانون ایک مخصوص انفرادیت و معاشرت نافذ کرنے کے لیے وضع کیا جاتا ہے اور یہی حال ہیومن رائٹس پر مبنی دستوری قانون کا بھی ہے جس کا مقصد سرمایہ دارانہ شخصیت (ہیومن) معاشرت (سول سوسائٹی) اور ریاست (ریپبلک) کا قیام و فروغ ہے۔ جو تحریکات خود کو اصولاً اور عملاً انقلابی کہتی بھی ہیں ان کے پاس بھی انقلابی عمل کا کوئی واضح لائحہ عمل موجود نہیں۔ ان کے انقلاب کا تصور بس یہ ہے کہ بہت سے لوگوں کو کسی دعوت کے تحت منظم کر کے حکومت وقت سے بھڑ جاؤ یا اس سے چند مطالبات تسلیم کرا لو۔ ظاہر ہے یہ تصور غلط ہے کیونکہ انقلابی عمل کا مطلب

قوت نافذہ کو موجودہ افراد اور اداروں سے چھین کر متبادل افراد اور ادارتی صف بندی کے تحت مربوط اور مجتمع کرنا ہوتا ہے۔ ہماری انقلابی تحریکات اس قسم کی سعی پر کوئی توجہ نہیں دیتیں کیونکہ وہ حکومت اور ریاست کے فرق کو سمجھ نہ سکیں۔ بہت سی انقلابی تحریکات ریاستی قوت کے متبادل ادارے قائم کرنے کو ناجائز گردانتی ہیں گویا وہ ریاست کے اندر ریاست قائم کیے بغیر انقلاب لانے کا خواب دیکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اصلاحی جماعتوں کی مانند انقلابی جماعتیں بھی تحریک لال مسجد کی انقلابی حکمت عملی کو غلط قرار دیتی رہیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ تاریخ میں کوئی انقلاب محض دعوت و تبلیغ کے زور پر نہیں آیا بلکہ اس کے لیے لازماً قوت کو غالب نظام اقتدار کے خلاف جمع کرنا پڑتا ہے اگر سیاسی جدوجہد کے نتیجے میں محض حکومتی افراد تبدیل ہو جائیں مگر اقتدار کا مرکز موجودہ ادارے ہی رہیں تو اس جدوجہد سے کوئی بامعنی تبدیلی نہیں ہو پاتی۔ وہ لوگ جو انقلابی عمل کی حقیقت اور حکومت و ریاست کے فرق کو نہیں پہچانتے وہ مجاہدین کی جدوجہد کو سمجھنے سے قاصر ہیں، وہ کبھی مجاہدین کے اقدام کو غم و غصے کا اظہار کہتے ہیں اور کبھی شدت پسندانہ رویے پر مبنی رد عمل، ایسے لوگ مجاہدین کی جدوجہد کو عالمی قوانین کی پاسداری کرنے کے حوالے سے شرع کی تعلیمات کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں، فیاللعجب!

رابعاً: یہ سمجھ لینا چاہیے کہ دور حاضر میں قائم اکثر و بیشتر مسلم ریاستیں کافرانہ نظم اجتماعی پر قائم ہیں گو کہ انہیں چلانے والے مسلمان ہیں۔ ان ریاستوں کا خلافت ہونا تو کجا سلطنت اسلامیہ کے درجے سے بھی دور کا واسطہ نہیں کیونکہ یہ تمام ریاستیں قومی ہیں جہاں حاکمیت کی بنیاد عوامی نمائندگی ہے- جہاں علوم شرعیہ کے بجائے سوشل سائنسز کی بالادستی ہے۔ جہاں شرع کے بجائے دستوری قانون نافذ ہے وغیرہ۔ انقلابیوں کا بنیادی مقدمہ یہی ہے کہ تحفظ اور غلبۂ اسلامی کا کام اسی وجہ سے انتشار کا شکار ہے کہ وہ اسلامی ریاست جو تسلسل کے ساتھ سلطان عبد الحمید ثانی کے دور تک قائم تھی اور جس نے تمام دینی کام کو سمیٹ رکھا تھا اب مفقود ہو گئی ہے۔ سلطان اسی معنی میں ظل اللہ تھا کہ اس کی برکت سے تمام دینی کام مربوط

تھے اور اقتدار کی کنجیاں علماء اور صوفیاء کے ہاتھوں میں محفوظ تھیں یہی وجہ ہے کہ مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ رحمہا اللہ نے مغل سلطنت کے استحکام کی کوششیں کیں (ماسوائے اکبر کی حکومت کے، کہ اس نے دینِ الٰہی کو فروغ دینے کی کوشش کی)۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہم یہ سمجھیں کہ باطل نظام اقتدار کے اندر غلبۂ دین کی کوشش بار آور نہیں ہو سکتی اور اسلامی ریاست قائم کرنا ضروری ہے۔

درج بالا جدوجہد مرتب کرنے کے لیے یہ سمجھنا لازم ہے کہ جس ریاستی نظم سے ہمارا مقابلہ ہے اس کی نوعیت کیا ہے؟ اور یہ ریاست کس طرح کام کرتی ہے؟ کیونکہ ان اصولی مباحث کو سمجھنے کے بعد ہی ہم یہ سوال اٹھا سکیں گے کہ کس طرح اسلامی ریاست قائم اور مستحکم کرنے کی جدوجہد کی جا سکتی ہے؟ اس مضمون میں پیش کردہ لبرل سرمایہ دارانہ ریاست کا عمومی خاکہ دو سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کرتا ہے: اول یہ کہ سرمایہ دارانہ اقتدار کس کے ہاتھ میں ہوتا ہے؟ دوم یہ کہ اقتدار کیسے قائم رکھا جاتا ہے؟ زیر نظر مضمون سے یہ بات بھی واضح ہو گی کہ حکومت اور ریاست (نظام اقتدار) میں بہت فرق ہوتا ہے حکومت محض ریاست کا ایک جزو ہے۔

ریاستی سطح پر سرمایہ دارانہ اقتدار کس طرح تشکیل پاتا ہے؟ فرماں روائی اور عمل داری کس کی ہوتی ہے؟

معاشرہ رضاکارانہ (voluntary) صف بندی سے تشکیل پاتا ہے یعنی افراد اپنی مرضی سے تعلقات استوار کرتے ہیں۔ اس کے برعکس ریاست نظام اقتدار کا نام ہے یعنی ریاست ایک جبری صف بندی کی تشکیل کرتی ہے۔ اب سب سے بنیادی سوال یہی ہے کہ لبرل سرمایہ دارانہ ریاست میں اصل اقتدار کس کو حاصل ہوتا ہے؟ لبرل سرمایہ دارانہ ریاست میں اصل اقتدار ان کو حاصل ہوتا ہے جو سرمایہ دارانہ عقلیت پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کے مؤید ہوتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ عقلیت کا تقاضا ہے کہ انسان کو تمتع فی الارض کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کیے جائیں۔ انسان کو اپنی خواہشات کی تکمیل کے زیادہ سے زیادہ مساوی مواقع

ملیں تو جو لوگ سرمایہ دارانہ لبرل ریاست میں صاحب اقتدار ہوتے ہیں، وہ اسی سرمایہ دارانہ عقلیت پر راسخ العقیدہ ایمان رکھتے ہیں اور یہی اُن کے اقتدار کا جواز ہوتا ہے۔

فرماں روائی اور عمل داری کیسے کی جاتی ہے؟

اب بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سرمایہ دارانہ عقلیت پر ایمان رکھنے والوں کا اقتدار کیسے قائم ہوتا ہے اور کیسے مستحکم ہوتا ہے؟ یہ اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب پورا معاشرہ سرمایہ دارانہ تعقل کو اصل عقلیت کے طور پر قبول کر لیتا ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب سرمایہ دارانہ عقلیت کی بنیاد پر ہی تمام یا زیادہ سے زیادہ فیصلے ہوں۔ گویا سرمایہ دارانہ عقلیت کو آفاقی بنا کر اقتدار کو مستحکم کیا جاتا ہے۔ جس قدر اس سرمایہ دارانہ عقلیت کی توسیع ہو گی، جس قدر سرمایہ دارانہ عقلیت کو معاشرے میں قبولیت عامہ حاصل ہوتی جائے گی، جتنا سرمایہ دارانہ عقلیت پر ایمان رکھنے والے اور سرمایہ دارانہ عقلیت کے داعی اس میں کامیاب ہوں گے، اتنا ہی ان کا اقتدار مستحکم ہو گا۔

ریاستی اقتدار

معاشرہ کے برعکس کہ جہاں تعلقات رضاکارانہ بنیادوں پر استوار ہوتے ہیں ریاست ایک نظامِ اقتدار کا نام ہے جس کے پاس اپنے فیصلوں کے نفاذ کے لئے ایک مخصوص علاقہ، آبادی، اور قوتِ نافذہ بھی موجود ہوتی ہے۔ گویا سرمایہ دارانہ عقلیت پر ایمان رکھنے والوں کے پاس محض خیال نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے فیصلوں کے نفاذ کے لیے ریاست کی قوت کو استعمال کرتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ لبرل ریاست میں دو مختلف طریقوں سے نظامِ اقتدار مرتب کیا جاتا ہے یعنی اس کے دو مختلف ڈھانچے ہوتے ہیں۔

- جمہوری طریقہ
- لبرل ڈکٹیٹر شپ یا آمریت

بہ ظاہر ان دونوں طرزہائے اقتدار کی ترتیب و تنظیم مختلف ہوتی ہے لیکن عملاً ان دونوں کے

نتیجے میں سرمایہ دارانہ عقلیت ہی غالب آتی ہے یعنی یہ دو قالب ہیں لیکن ان دونوں کی روح "سرمایہ دارانہ عقلیت" ہی ہے۔ ان دونوں طرز ہائے اقتدار کو استعمال کر کے سرمایہ دارانہ عقلیت ہی کو آفاقی بنایا جاتا ہے اور ان بہ ظاہر دو مختلف طرز ہائے اقتدار میں فیصلے سرمایہ دارانہ عقلیت کی بنیاد پر ہی کئے جاتے ہیں اور اسی کو مقبول عام بنائے جانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ پاکستان کے تناظر میں دینی جماعتوں کی توجہ "سرمایہ دارانہ عقلیت" کی مرکزی بحث کے بجائے اس کے قالب یعنی آمریت اور جمہوریت پر مرکوز ہوگئی ہے۔ پاکستان میں دینی جماعتیں سمجھتی ہیں کہ ان کو جمہوری طرز کی حکومت میں اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کی زیادہ آزادی میسر آتی ہے (گو کہ ان پر یہ بھی الزام عائد کیا جاتا ہے کہ ان کو زیادہ فائدہ آمریت کی حکومتوں نے پہنچایا ہے)۔ لیکن ان کو یہ سمجھنا چاہیے کہ جمہوریت یا آمریت میں روح ایک ہی کارفرما ہے اور ان کے متبادل کے بجائے انہی دونوں میں گنجائشیں تلاش کرنے سے ان دونوں نظاموں ہی کو استحکام حاصل ہوتا ہے۔ گنجائش تلاش کرنے سے یہ دونوں نظام کمزور نہیں ہوتے یا ان کو پیچھے نہیں دھکیلا جاسکتا۔

فرماں روائی کا طریقۂ عمل اور اس کے دو مختلف تصورات

فرماں روائی کے طریقۂ عمل (Governance process) سے مراد یہ ہے کہ کس طریقے سے احکام صادر کیے جارہے ہیں؟ اور کس طریقے سے احکام نافذ کیے جارہے ہیں؟ نظامِ اقتدار کو مرتب کرنے کے لیے ضروری ہے کہ محض احکام دیے نہ جارہے ہوں بلکہ ان کو نافذ کرنے کے لیے بھی پوری حکمت عملی اور مشینری موجود ہو۔ گویا طریقۂ عمل سے مراد سرمایہ دارانہ عقلیت کی آفاقیت اور اس کے غلبے کو ممکن بنانے کا مخصوص طرز ہے۔ اس سلسلے میں دو مختلف تصورات پائے جاتے ہیں:

ایک تصور تو یہ ہے کہ ہر فرد فطرتاً یہی چاہتا ہے کہ اسے تمتع فی الارض اور خواہشات کو پورا کرنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع میسر آئیں یعنی معاشرہ اس بات پر راضی ہے اور معاشرے کے ہر فرد کی یہی خواہش ہے کہ سرمایہ دارانہ عقلیت پر ہی زندگی کے ہر شعبے کے ہر دائرۂ کار

میں فیصلے کیے جائیں اور سرمایہ دارانہ عقلیت ہی کو غلبہ حاصل ہو۔ یہ وہ نقطۂ نگاہ ہے جو اٹھارویں صدی کے اندر اسکاٹ لینڈی تنویریت Scottish enlightenment کے مفکرین اور کانٹ کی فکر میں ملتا ہے کہ فطرت انسانی کا تقاضا ہی یہ ہے کہ اس کی تمام خواہشات نفسانی کی تسکین ہو لہٰذا ریاست (اسٹیٹ) کو سوسائٹی پر تسلط کی ضرورت نہیں بلکہ ریاست معاشرے کے مختلف افراد جو خواہشات رکھتے ہیں انہی کو پورا اور نافذ کرنے کا معقول ترین طریقہ وضع کرتی ہے۔ گویا سرمایہ دارانہ لبرل ریاست سرمایہ دارانہ معاشرے کی خواہشات کو پورا کرنے کا "ذریعہ" ہوتی ہے لہٰذا اصولاً وہ اس کی تابع ہوتی ہے۔

دوسرا تصور یہ ہے کہ معاشرے کے افراد نہیں جانتے کہ انہیں کیا چاہنا چاہیے۔ وہ عقلیت اصلیہ یعنی سرمایہ دارانہ عقلیت کے تقاضوں سے ناواقف ہوتے ہیں لہٰذا ایک ایسے گروہ کی ضرورت ہے جو اصلی عقلیت کا نمائندہ ہو۔ یہی گروہ پوری انسانیت کا نمائندہ گروہ ہے۔ اس گروہ کی ذمہ داری ہے کہ آمریت قائم کر کے لوگوں کو مجبور کرے کہ اس اصلی عقلیت (سرمایہ دارانہ عقلیت) کے مطابق تمام فیصلے کیے جائیں۔ گویا ریاست محض معاشرے کے تابع نہیں ہے بلکہ اس کو معاشرے پر غالب ہونا چاہیے اور اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ عقلیت اصلیہ کو معاشرتی سطح پر اور انفرادی سطح پر نافذ کرنے کے لیے نظام اقتدار کھڑا کرے۔ اب یہ گروہ کون سا ہے؟ اس کے بارے میں اختلاف ہو سکتا ہے (وہ مزدوروں کی آمریت یا مخصوص طبقہ یا قوم پر مشتمل گروہ ہو سکتا ہے)۔

واضح رہے کہ مندرجہ بالا دونوں دونوں تصورات و نظریات ریاست کے اندر خواہشاتِ نفسانیہ کی زیادہ سے زیادہ تکمیل کی جدوجہد ہی کو جواز فراہم کرتے ہیں۔ ان کا طریقہ مختلف ہے۔ ایک طریقے میں ریاست معاشرہ کے ماتحت ہے اور ریاست ان خواہشات کو پورا کر رہی ہے جو معاشرے کی حرکیات Dynamic میں خود بہ خود ابھر کر سامنے آ رہی ہیں اور ریاست ان کی ترتیب، تقدیم اور تاخیر کا ایک ذریعہ ہے۔ دوسرے طریقے میں ریاست کو معاشرے پر غلبہ حاصل ہوتا ہے اور وہ یہ فیصلہ کرتی ہے کہ لوگوں کو کیا چاہنا چاہیے اور اس

کے حصول کا بہترین طریقہ کیا ہے؟

[عملاً جو سرمایہ دارانہ ریاستیں اور معاشرے تاریخی طور پر وجود میں آئے ہیں وہ ان دونوں نظریات کا ملغوبہ ہوتے ہیں۔ کبھی ایک تصور غالب ہوتا ہے تو کبھی دوسرا، لیکن تمام سرمایہ دانہ ریاستوں میں یہ دونوں تصورات اور ان کے درمیان کشمکش ہمیشہ جاری رہتی ہے]

سرمایہ دارانہ عقلیت کے نفاذ کے لیے تین بنیادی فرائض

سرمایہ دارانہ عقلیت کے حاملین سرمایہ دارانہ نظام اقتدار کو معاشرتی سطح پر مرتب کرنے کی جو کوشش کرتے ہیں، اس کے لئے انہیں تین بنیادی فرائض ادا کرنے پڑتے ہیں۔

(۱) مارکیٹ کے اندر قدر کے تعین کا واحد پیمانہ سرمایے کا عمل بن جائے۔

(۲) سرمایے کی بڑھوتری کا تعقل یعنی ریشنلٹی پورے معاشرے پر حاوی ہو جائے اور زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہ رہے جو سرمایہ دارانہ عقلیت سے ماوراہو۔

(۳) نمبر ۱ اور نمبر ۲ کو قبولیت عامہ اور جوازِ عمومی حاصل ہو جائے۔

سرمایہ دارانہ عقلیت کو غالب کرنے کے لیے ضروری ہے کہ زندگی کے ہر دائرۂ کار میں تمام اعمال کو اس واحد عمل کے اردگرد مجتمع کر دیا جائے۔ یعنی سرمایے کی بڑھوتری مستقلاً تیز ہوتی چلی جائے اور سرمایے کی بڑھوتریٔ محض خود اپنا جواز ہو۔ ہر معاشرتی یا انفرادی عمل کا مقصدِ اولین (Ultimate end) یہی ہو کیونکہ سرمایہ (Capital) ہی "آزادی" (Freedom) کی مجسم شکل ہے۔ یہ عمل پہلے مارکیٹ کی سطح پر ہوتا ہے، جہاں اس کو واحد معقول پیمانۂ خیر و شر کے طور پر قبول کر لیا جاتا ہے اور کسی بھی عمل کو صرف اسی بنیاد پر جانچا جاتا ہے کہ اس مخصوص عمل کے نتیجے میں سرمایہ کی بڑھوتری کی رفتار میں تیزی آ رہی ہے یا کمی ہو رہی ہے۔ یعنی فرد کے مخصوص عمل کے نتیجے میں سرمایہ کی بڑھوتری کی رفتار پر کیا فرق پڑ رہا ہے؟ اگر زید کی مخصوص نوکری کے نتیجے میں سرمایے کی بڑھوتری کی رفتار میں اس سے کم اضافہ ہوتا ہے جتنا ایک اسٹاک بروکر کی کاوش کے نتیجے میں ہوتا ہے تو معقول بات اور جائز بات یہی ہے کہ زید کی تنخواہ اسٹاک بروکر کے مقابلے میں کم ہو کیونکہ سرمایے کی بڑھوتری

کے عمل کو آگے بڑھانے میں زید کا حصہ (Contribution) اس سے کم ہے جو اسٹاک بروکر کا ہے۔ گویا مارکیٹ کی سطح پر جو معقول پیمانۂ خیر و شر مسلط ہو جاتا ہے اور جسے قبول کیا جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں ایک فرد کو تمتع فی الارض کی جو اجازت دی جاتی ہے، وہ اس سے ہم آہنگ ہوتی ہے کہ وہ سرمایے کی بڑھوتری کے عمل کو کتنا مہمیز دیتا ہے؟

معاشرے کے اندر مارکیٹ ایک دائرہ کار ہے۔ مارکیٹ کے باہر بھی فرد بہت سے تعلقات کو تشکیل دیتا ہے اور یہ ضروری نہیں کہ وہ ان تعلقات کی تشکیل بھی سرمایہ دارانہ عقلیت یا بڑھوتریٔ سرمایہ کی بنیاد پر کرے۔ مثلاً خاندانی تعلقات عموماً ایثار و محبت کی بنیاد پر تشکیل پاتے ہیں۔ لیکن سرمایہ دارانہ اشرافیہ اور سرمایہ دارانہ عقلیت میں راسخ العقیدہ لوگوں کی کوشش ہوتی ہے کہ بڑھوتریٔ سرمایہ کا جو اصول یعنی بڑھوتری برائے بڑھوتری (Principal of Capital accumulation) واحد معقول پیمانے کے طور پر مارکیٹ میں تسلیم کر لیا گیا ہے یہ صرف مارکیٹ تک محدود نہ رہے بلکہ آفاقی ہو جائے۔ خاندان بھی مارکیٹ کا حصہ ہو جائیں۔ افراد رشتۂ ازواج میں منسلک ہوتے ہوئے ایمان داری، نسب و شرافت، خاندان اور کفو کو اہمیت نہ دیں بلکہ کیریئر یا پیسے کو مد نظر رکھیں۔ بچوں کی تربیت کرتے ہوئے بھی سرمایہ دارانہ تعقل کو نظر انداز نہ کریں۔ برادریاں، قبیلے، قوم اور حتیٰ کہ مذہبی ادارے بھی مارکیٹ کے اس تعقل کا حصہ بن جائیں۔ فرد صرف مارکیٹ کے عمل میں سرمایے کا ایجنٹ نہ ہو بلکہ زندگی کا ہر کردار نبھاتے ہوئے وہ سرمائے کا آلہ کار ہو۔ اس کو سرمایہ دارانہ سماج کاری (Capitalist socialization) کہتے ہیں اور جہاں اس قسم کی سرمایہ دارانہ انفرادیت مکمل طور پر عالمگیر ہو جاتی ہے اس معاشرے کو سرمایہ دارانہ معاشرہ کہتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ سماج کاری وہ عمل ہے جس کے نتیجے میں معاشرہ سرمایہ دارانہ خطوط پر استوار ہوتا ہے۔

تیسرا فرض یہی ہوتا ہے کہ یہ دونوں طرح کے فرائض محض زبردستی نافذ نہ کیے جا رہے ہوں بلکہ ان کو قبولیت عامہ اور جواز عمومی حاصل ہو۔ عام آدمی کے لیے یہی معقول پیمانۂ خیر و شر اور پیمانۂ عمل بن جائے اور جب فرد کا ہر عمل بڑھوتریٔ سرمایہ کے تحت آجائے تو فرد خود

اپنے دل میں یہ محسوس کرے کہ میں کامیاب ہو گیا ہوں اور زندگی کے ہر شعبے کے اندر سرمایے کی بڑھوتری کو مہمیز دینے کی بنیاد پر اپنی مرضی سے اپنے اعمال کا تعین کرے۔ کسی معاشرے میں کس قدر سرمایہ دارانہ جبر کی ضرورت ہے اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ افراد کتنے سرمایہ دار ہو چکے ہیں؟

سرمایے کی فرماں روائی اور عمل داری کو کن افراد کے ذریعے ممکن بنایا جاتا ہے؟

سرمایہ دارانہ عقلیت کوئی فطری چیز نہیں ہے بلکہ انتہائی غیر فطری چیز ہے، اس لیے سرمایہ دارانہ تعقل کو پورے نظامِ زندگی پر غالب کرنے کیلئے خصوصی کوشش کی جاتی ہے، اس میں مخصوص افراد اور اداروں کی اہمیت ہوتی ہے، پہلے ہم ان افراد کا تذکرہ کرتے ہیں جو سرمایہ دارانہ عقلیت کو قبولیت عامہ دلوانے اور سرمایہ دارانہ عقلیت کو غلبہ دلانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

دانشور (Intellectual): یہ وہ فرد ہے جو قدیم مذہبی علمیت اور قیادت کا فطری مخالف ہے۔ مذہبی علمیت کی بنیاد یہ ہوتی ہے کہ ہر عمل کی انجام دہی سے پہلے اللہ تعالیٰ کی رضامندی و مرضی تلاش کی جائے۔ احکامات کا استنباط اس طرح کیا جائے کہ اللہ کی مرضی و منشاء سے قریب تر ہونا ممکن ہو سکے اور اللہ تعالیٰ کی مرضی کی اطاعت ممکن ہو سکے، اس کے برعکس دانشور کا ظہور اٹھارہویں صدی میں ہوا اور یہ مذہبی علمیت کے برعکس دوسری علمیت کا علمبردار ہوتا ہے۔ یہ مذہبی علمیت سے علی الرغم ادراک حقیقت کا قائل ہوتا ہے۔ یہ انسان کی آزادی اور مساوات کا قائل ہوتا ہے اور ان راہوں کی نشاندہی کرتا ہے جن کے نتیجے میں انسانیت زیادہ سے زیادہ مساوی آزادی حاصل کر کے اپنی خواہشات (نفسانیہ) کو پورا کر سکتی ہے۔

کلچرل ہیروز: اس ریاستی نظام میں چوں کہ تمتع فی الارض اور نفسانی خواہشات کی تکمیل عمل

کی قدر کے تعین کی بنیاد بنتے ہیں، لہٰذا ایسے لوگوں کی نشو و نما اور تشہیر کی بہت ضرورت ہوتی ہے جو اس کام میں کامیاب ہو جائیں۔ عموماً یہ دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔

اسپورٹس مین: لبرل نظام میں کھیلوں (لہو و لعب) کی خاص اہمیت ہے، مقامی سطح سے لے کر ملکی اور بین الاقوامی سطح پر کھیلوں کے مقابلوں کا ایک مستقل سلسلہ لبرل ریاستوں کے تعاون سے جاری رہتا ہے اور مختلف قسم کے کھیل کھیلنے والوں کو ہیروز کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

سائنس دان: (سائنسز سے وابستہ افراد میں فزیکل اور سوشل سائنسز سے وابستہ افراد شامل ہیں) یہ وہ افراد ہیں جنہوں نے کائنات کی طبعی قوتوں پر انسان کا غلبہ اور اختیار بڑھا دیا ہے اور اس اختیار کو بڑھانے کا مقصد تمتع فی الارض ہے۔ ایک زمانے میں یہ فزیکل سائنسدان ہوتے تھے مگر آج کل میڈیسن اور بائیو ٹیکنالوجی سے وابستہ افراد کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

ان ہیروز (Heroes) کو یہ مواقع فراہم کیے جاتے ہیں کہ یہ معاشرے کے رول ماڈل بن جائیں۔ لوگ ان کلچرل ہیروز کو بزرگان دین کی جگہ رکھنے لگیں، علماء اور صوفیاء کو بے وقوف سمجھنے لگیں اور اصلی عوامی لیڈر شپ کا منصب ان تین طرح کے لوگوں کے پاس آ جائے۔ اصلی عوامی لیڈر شپ عموماً سیاسی نہیں ہوتی بلکہ اصلی عوامی لیڈر شپ ان کلچرل ہیروز کے ذریعے پیدا کی جاتی ہے۔ ان کلچرل ہیروز کے "مداح" اپنی زندگی میں ان کا طرزِ زندگی اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ٹیکنو کریٹ اور بیوروکریٹ: ٹیکنو کریسی اور بیوروکریسی بھی سرمایہ دارانہ ریاستوں کے انتظام سے متعلق خاص چیز ہے۔ یہ ایسی اشرافیہ ہوتی ہے جو سرمایہ داری کے مجموعی مفادات کی بنیاد پر انفرادی سرمایہ دارانہ عمل کی تحدید اور ترتیب کرتی ہے۔ اس کا اپنا مفاد اس میں پنہاں ہوتا ہے کہ سرمایہ داری کے مجموعی مفادات کتنے حاصل ہو رہے ہیں؟ ان کو سرمایے کے مجموعی مفادات کے نمائندوں کے طور پر قبول کیا جاتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کا ایک مستقل مسئلہ یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں کوئی عمومی ایجنٹ پیدا نہیں ہوتا۔ مارکیٹ کا جو طریقہ اور نظم قائم ہے اس میں ہر کمپنی اپنے مفادات کی نگرانی اور

تحفظ کے لیے سرگرم عمل ہوتی ہے۔ اس کو صرف اس بات سے غرض ہوتی ہے کہ اس کا منافع زیادہ سے زیادہ ہو جائے۔ اس لئے اس نظم میں عمومی سرمایے کے تحفظ کے نمائندے نہیں ہوتے جو اس بات پر نظر رکھ سکیں کہ کوئی مخصوص کمپنی اپنا منافع زیادہ سے زیادہ کرنے کیلئے کوئی ایسا کام تو نہیں کر رہی جس سے مجموعی بڑھوتری سرمایہ کو روکا جا رہا ہو۔ ٹیکنوکریسی اور بیوروکریسی یہ بتاتی ہے کہ تمتع فی الارض کا بہترین طریقہ کیا ہے اور ان سے امید کی جاتی ہے کہ وہ اپنے مفادات سے اوپر اٹھ کر مجموعی سرمایے کے ایجنٹوں کا رول ادا کریں گے۔ ان کی وفاداریاں اور غیر جانبداریاں (impartiality) سرمایہ دارانہ نظام سے وابستہ ہوتی ہیں۔ اس کے لیے انہیں مخصوص امتحانی نظام سے گزار کر سامنے لایا جاتا ہے اور عمومی نمائندوں کے برعکس ان کی حیثیت ایک مستقل نوعیت کی ہوتی ہے۔ قانون سازی میں بھی یہ اہم رول ادا کرتے ہیں۔ یہ کسی بھی سرمایہ دارانہ نظریے پر ایمان رکھنے والے ہو سکتے ہیں، چاہے لبرل ہوں یا مسلم قوم پرست یا کمیونسٹ، سرمایہ دارانہ نظام کا تقاضا ہے کہ ایسا گروہ مستقل تیار ہوتا رہے اور یہ نظریاتی گروہ برسر اقتدار بھی ہو اور اس کا اقتدار مقبول عام بھی ہو۔

آرمڈ فورسز (armed forces): اس کی زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں، یہ سرمایہ داری کو لاحق خطرے کے وقت سامنے آتے ہیں اور سرمایہ داری کا آخری دفاع یہی لوگ کرتے ہیں۔ ہر ملک کی عموماً اپنی آرمی، پولیس اور ریزرو فورسز وغیرہ ہوتی ہیں۔

استعماری ایجنٹ (Imperial oversight agents): یہ وہ مقامی افراد ہوتے ہیں جن کا فکری تناظر، جن کے مفادات اور وفاداریاں عالمی استعمار کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں۔ چونکہ سرمایہ دارانہ نظام ایک عالمی نظام ہو گیا ہے اور سرمایہ داری کی جو اصل قوت نافذہ ہے وہ امریکہ ہے، اس قوت نافذہ کی ایک ضرورت یہ ہوتی ہے کہ براہِ راست اپنے افراد کے بجائے وہ ایسے مقامی افراد کے ذریعے حکومت کے کاموں میں دخیل ہو جن کی بنیادی وفاداریاں امریکی استعمار / ایمپائر کے ساتھ ہوں۔ وہ بود و باش تو مقامی لوگوں کا سا رکھیں لیکن انکا تمام

تر طرزِ زندگی ایمپائر کا سا ہو۔ گویا یہ ایمپائر کے غیر مقامی شہری (non national citizens) ہوتے ہیں۔ انگریزوں کی حکومت نے جب محسوس کیا کہ ان کی حکومت کو مقبولیت حاصل نہیں ہے تو انہوں نے مختلف طریقوں خصوصاً تعلیمی نظام کے ذریعے ایسے لوگ تیار کئے اور صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ ساری تیسری دنیا کے اندر ایسے لوگوں کی پوری نسل تیار کی گئی جو فطرتاً ایمپائر ہی کے لوگ ہوں۔ یہ لوگ کلیدی مقامات پر فائز کیے جاتے ہیں۔

حاملین اقتدار ادارے

ہم ان افراد کا تذکرہ کر چکے ہیں جو سرمایہ دارانہ عقلیت کو قبولیت عامہ اور غلبہ دلانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، اب ان اداروں کا تذکرہ ہے جن کے ذریعے یہ افراد اقتدار کی ترتیب عمل میں لاتے ہیں۔

کارپوریشن: کارپوریشن کے اندر نظامِ اقتدارِ سرمایہ داری اپنی کامل ترین شکل میں ہوتا ہے، جہاں ایک فرد سرمایہ دارانہ بندھنوں میں ایسے جکڑا ہوتا ہے کہ بڑھوتریٔ سرمایہ کا ایجنٹ بننے کے سوا اور کچھ ممکن نہیں ہوتا۔ کارپوریشن کے اندر جو ترتیبِ نظم ہوتی ہے اس کے نتیجے میں معاش کے پورے عمل پر جس طرح سرمایہ دارانہ عقلیت غالب آتی ہے اور کہیں غالب نہیں آتی۔ سرمایہ دارانہ نظام میں کارپوریشن کے ذریعے ذاتی ملکیت کو ختم کر کے سرمایے کی ملکیت قائم کی جاتی ہے۔ سرمایہ دارانہ تعقل کے لئے انسان کے جاگتے اوقات میں اس کو خاص قسم کے نظم وضبط میں سمو دیا جاتا ہے اور اس کے ان اوقات میں اسے سرمایے کا خادم بنا دیا جاتا ہے۔ کارپوریشن وہ شخصِ قانونی ہے جس کا اکیلا وظیفہ یہ ہے کہ سرمایے کی بڑھوتری کے پیمانے پر اپنے تمام اعمال کو مرتب کرے۔ کارپوریشن کو چلانے والے مینیجر ہوتے ہیں، جو عملاً بڑھوتریٔ سرمایہ کی مشین ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ماتحت ملازمین کو بھی اس واحد پیمانے پر پرکھتے ہیں کہ وہ بڑھوتریٔ سرمایہ کے باعث بن رہے ہیں کہ نہیں؟ ایک معیشت میں جس قدر کارپوریشن کا عمل دخل بڑھتا ہے اتنی ہی ذاتی ملکیت کم ہوتی جاتی ہے۔

بینک اور مالی ادارے: کارپوریشن کے علاوہ دوسرا ذریعہ بینک اور فنانشل ادارے ہیں۔ یہ بھی خالصتاً سرمایہ دارانہ ادارے ہیں۔ ان کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ سرمایے کی بڑھوتری کی بنیاد پر قدر کے تعین کا ایسا نظام نافذ اور قائم کریں کہ زر کی مارکیٹ اور اسٹاک مارکیٹ (capital market) پیداواری عمل کے نظام پر حکم لگانے کی پوزیشن میں آجائے۔ اس کے لیے بنک یہ فریضہ انجام دیتے ہیں کہ لوگوں کی بچتوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں تاکہ لوگ اپنے فاضل سرمایے کو خود استعمال نہ کریں بلکہ بینک میں کھاتے کھول لیں اور بینک اس رقم کو سرمایے کے چکر (circle of capital) میں شامل کر دیں۔ انہی اداروں کے ذریعے سرمایہ داری کو عالمگیر کرنے میں مدد ملتی ہے۔

فنانشل ریگولیشن (زری تنظیم): سرمایہ دارانہ نظام میں مختلف کمپنیاں اپنے اپنے منافع کو بڑھانے کے لیے مسلسل مسابقت کرتی ہیں۔ اس لیے ایک ریگولیٹری اتھارٹی کی ضرورت ہوتی ہے جو یہ نظر رکھتی ہے کہ اس مسابقت کے نتیجے میں سرمایہ دارانہ نظام بحیثیت مجموعی کسی نظاماتی بحران سے دوچار نہ ہو۔ یہ ریگولیٹری اتھارٹی اس نظاماتی بحران سے بچانے کے لیے پیسے کی رفتارِ پیداوار میں کمی یا زیادتی کا فیصلہ کرتی ہے۔ بہ ظاہر تو یہ خاص حکومت کا کام لگتا ہے لیکن اب صرف اسٹیٹ بینک یہ کام نہیں کرتا بلکہ عالمی مالیاتی اور زری ادارے بھی اس میں دخل اندازی کرتے ہیں اور پرائیوٹ سیکٹر میں بھی ایسی ریٹنگ (Rating) ایجنسیاں آگئی ہیں، مثلاً جے پی مورگن وغیرہ، جن کا اس سلسلے میں اہم کردار ہوتا ہے۔

لیبر یونینز (مزدوروں کی تنظیمیں): کبھی کبھار یہ بھی ہوتا ہے کہ ٹریڈ یونینز بھی سرمایہ دارانہ عقلیت کو غالب کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ انفرادی طور پر تو کارپوریشن کے اندر ہیومن ریسورس مینجمنٹ کے ذریعے یہ کام کیا ہی جارہا ہے لیکن اجتماعی طور پر مزدوروں کو سرمایہ دارانہ عقلیت سے بہرہ ور کرنے کا کام مزدور یونینز بھی کرتی ہیں۔ وہ مزدور قوتوں کو اس مقصد کے گرد منظم کرتی ہیں کہ سرمایہ دارانہ عقلیت کے فروغ کے نتیجے میں جو فوائد حاصل ہو رہے ہیں، ان میں اپنا حصہ طلب کریں اور مزدور بھی اجتماعی طور پر سرمایہ کی

بڑھوتری کے عمل کو مہمیز دینے میں اپنا کردار ادا کریں اور ان کے مفادات بڑھوتریٔ سرمایہ کے اہداف سے زیادہ سے زیادہ ہم آہنگ ہو سکیں۔

انتظامیہ (مقامی اور قومی): کسی بھی ملک کے معاملات چلانے کے لیے انہیں مختلف شعبوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے مثلاً داخلہ امور، خارجہ امور، دفاعی امور، تعلیمی امور، معاشی امور اور ان سب امور کو چلانے کے لیے ہر ملک میں انتظامیہ کا ادارہ ہوتا ہے۔ جس کی تنظیم مقامی سے لے کر قومی سطح تک موجود ہوتی ہے۔ انتظامیہ کے ادارے کا کام محض قانون کا نفاذ نہیں ہوتا بلکہ وہ قانون سازی میں بھی نمایاں طور پر حصہ لیتا ہے۔ اکثر قوانین کے مسودے انتظامیہ ہی تیار کرتی ہے۔ عملاً انتظامیہ ہی مقننہ کی رہنمائی کرتی ہے اور اس پر حاوی ہوتی ہے اور اس کو سرمایہ دارانہ ڈگر سے نہیں ہٹنے دیتی۔

میڈیا: اس میں اخبارات ورسائل، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ وغیرہ شامل ہیں۔ یہ سرمایہ دارانہ دائرۂ اقتدار کو وسیع کرنے کا اہم ادارہ ہے۔ میڈیا کے سب شعبے یعنی انٹرٹینمنٹ، ایڈورٹائزنگ ور انفارمیشن پہنچانے کا عمل سرمایہ دارانہ نظامِ اقتدار کے استحکام کا باعث بنتے ہیں۔ انٹرٹینمنٹ انڈسٹری سے وابستہ لوگوں کو رول ماڈل اور ہیرو بنایا جاتا ہے۔ ایڈورٹائزنگ کے ذریعے سرمایہ دارانہ کارپوریشن کے مال کی طلب پیدا کر کے اس کی کھپت ممکن بنائی جاتی ہے اور انفارمیشن پہنچانے کے عمل کو بھی مختلف طریقوں (لائسنسنگ پر کنٹرول) کے ذریعے منظم / ریگولیٹ کیا جاتا ہے۔ میڈیا کا وسیع نیٹ ورک سرمایہ دارانہ ریاست کے ماتحت ہی ہوتا ہے۔

عدالتیں: عدلیہ بنیادی طور پر لبرل دستور کی محافظ ہوتی ہے۔ یہ لبرل دستور کی بنیاد پر شہریوں کے دو فریقوں یا سٹیزن اور مملکت اور اس کے مختلف اداروں کے درمیان متنازعہ امور کے فیصلے کرتی ہے۔ ان معنوں میں کورٹس کا بنیادی فریضہ روزمرہ معاملات کی دستور سے ہم آہنگ تشریح و توضیح کرنا اور مخصوص معاملات پر اس کا اطلاق کرنا ہے۔ دستور جیسا کہ ہم جانتے ہیں ایسی آزادیوں اور حقوق کے مجموعے کا نام ہے جو فرد کو سرمایے کی بڑھوتری کے

فرض کو پورا کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ ان میں سب سے اہم سرمایہ دارانہ ملکیت کا تحفظ اور آزادی کا تحفظ ہے۔

پولیس: پولیس کے محکمے کا سرمایہ دارانہ اشرافیہ اور عدلیہ سے مخصوص نوعیت کا تعلق ہوتا ہے۔ ریاست میں سرمایہ دارانہ عدل کی بنیاد پر جو فیصلے کیے جاتے ہیں، ان فیصلوں کا نفاذ پولیس کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ معاشرہ اور ریاست جس مخصوص نہج پر استوار ہوتے ہیں اس مخصوص نہج سے انحراف کرنے والوں پر پولیس نظر رکھتی ہے۔ بعض اوقات سرمایہ دارانہ اشرافیہ اپنے مخالفین کو کچلنے کا کام بھی پولیس سے لیتی ہے۔

آرمڈ فورسز: سرمایہ دارانہ ریاستیں عملاً قومی ریاستیں ہوتی ہیں اور اس قومی ریاست کو اصولاً اقتدار اعلیٰ حاصل ہوتا ہے یعنی نہ تو اندرون ملک کوئی فرد یا گروہ ریاست کے دائرۂ اختیار سے باہر ہو سکتا ہے اور نہ کوئی بیرونی طاقت یا گروہ اس نیشن اسٹیٹ کی مرضی کے بغیر اس کے حاصل کردہ اختیار کو چیلنج کر سکتی ہے۔ اقتدار اعلیٰ کے اس تحفظ کے لیے بنیادی طور پر فوج کا ادارہ ہوتا ہے۔ سرمایہ دارانہ لبرل ریاست کا آخری دفاع آرمڈ فورسز ہی کرتی ہیں۔

مقننہ (Legislation): مقننہ عموماً دو ایوانوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ایوانِ زیریں عوام کی نمائندہ سمجھی جاتی ہے اور ایوانِ بالا میں مخصوص طبقوں یا علاقوں کو نمائندگی دی جاتی ہے۔ انتخاب کی غرض سے تمام ملک کو مختلف حلقوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور ہر حلقے سے اراکین کی مقررہ تعداد ایک متعینہ مدت کے لیے ایوانِ زیریں میں نمائندگی حاصل کرتی ہے۔ اصولی طور پر مقننہ کا اولین فرض قانون سازی ہوتا ہے اور عوام کے نمائندے معاشرہ کے بدلتے ہوئے حالات اور وقت کے تقاضوں کے مطابق قانون بناتے ہیں۔ قوانین میں ردو بدل کرنا یا ان کی تنسیخ کرنا بھی مقننہ کا کام ہوتا ہے اور تمام ارکان کے بحث و مباحثہ اور اظہارِ خیال کے بعد مقننہ کو اختیار ہوتا ہے کہ کثرتِ رائے سے پیش کیے جانے والے بل کو منظور کر دے لیکن فی الواقع جدید دور میں یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ مقننہ کا کردار مسلسل کم ہو رہا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ تو وہی ہے کہ سرمایہ دارانہ لبرل ریاستوں کو عالمی سرمایہ دارانہ استعماری

ریاست اپنی مرضی کے قوانین بنانے پر مجبور کرتی ہے اور عموماً یہ کام ٹیکنو کریسی کرتی ہے۔ مقامی ٹیکنو کریسی بھی صرف وہ اقدامات بروئے کار لاتی ہے جو عالمی سرمایہ دارانہ قوانین سے ہم آہنگ ہوں۔ جب مقننہ کا بنیادی فریضہ ہی ادا نہ ہو تو گویا یہ کمزور ترین ادارہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی چند جزوی وجوہات ایسی ہیں کہ مقننہ کا کردار کم سے کم ہوتا جا رہا ہے۔ مثلاً ہر انفرادی ممبر اپنی جماعت کی طرف سے پیش کیے گئے بل کی عموماً توثیق ہی کرتا ہے۔ چنانچہ اس عمل سے اس کی عدم دلچسپی بڑھتی جاتی ہے۔ مقننہ کے اندر متعلقہ شعبے کے ماہرین مثلاً دفاعی، معاشی، تعلیمی، معاشرتی ماہرین کم ہوتے ہیں، اس لیے وہ اس شعبے سے متعلق قانون سازی کی سکت ہی اپنے اندر نہیں پاتے لہٰذا صرف پاکستان کی مثال ہی نہیں بلکہ یورپ اور امریکہ ہر جگہ اب پارلیمنٹ یا مقننہ کا کوئی کردار نہیں رہ گیا۔ پارلیمنٹ تو محض کھیل تماشہ ہے کیونکہ حکومتوں میں تبدیلیوں کے نتیجے میں پالیسیوں کے اندر کسی قسم کی تبدیلی نہیں آتی۔

عالمی ریٹنگ ایجنسیاں اور نگراں ایجنسیاں: اب بین الاقوامی سطح پر ایسے ادارے وجود میں آ چکے ہیں جو ملکی سطح پر اہم ترین امور میں مکمل دخیل ہو چکے ہیں۔ مثلاً آئی ایم ایف، ورلڈ بینک، یونائیٹڈ نیشن کے مختلف ادارے، انہوں نے قومی اداروں سے مخصوص نوعیت کا تعلق استوار کر لیا ہے۔ آئی ایم ایف کے پاس نہ صرف یہ سکت ہے کہ وہ ہماری معاشی پالیسی کے بارے میں فیصلہ کرے بلکہ وہ اپنے فیصلے کے نفاذ کا ایک خاص طریقہ / میکنزم بھی رکھتا ہے۔ اسی طرح اب پرائیوٹ سیکٹر کی ریٹنگ ایجنسیوں کا ظہور بھی ہو رہا ہے۔ یہ ایجنسیاں سرمایہ دارانہ اصولوں کی بنیاد پر ملکوں کی کارکردگی کو مسلسل جانچتی رہتی ہیں اور ان کی جانچ کا اثر کسی ملک میں ہونے والی بیرونی اور اندرونی سرمایہ کاری پر پڑتا ہے۔

تعلیمی نظام: سرمایہ دارانہ علمیت اس وقت غالب آتی ہے جب مذہبی علمیت پر سے لوگوں کا اعتبار اٹھ جاتا ہے۔ یہ عمل مغرب کے اندر اٹھارھویں صدی میں پروان چڑھا۔ کلیسا جو کہ قدیم مذہبی علمیت کا علمبردار تھا، اس کو دورِ تنویر کے مفکرین نے شکست دے دی۔ تنویری

فکر کی بنیاد پر جن علوم کا ظہور ہوا انہیں فزیکل سائنسز اور سوشل سائنسز میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام کی ٹیکنالوجی اور سرمایہ دارانہ عقلیت کو جواز فراہم کرنے والے علوم ہیں۔ ان کی بنیاد پر مغرب کا پورا نظام تعلیم تشکیل پایا۔ تیسری دنیا پر استعماری طاقتوں کے غلبے کے بعد وہاں بھی یہی تعلیمی نظام مستحکم ہوا۔ اب اسکول کی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک کا یہی مکمل نظام ہے جسے لوگوں نے برضا و رغبت قبول کر لیا ہے اور مذہبی علوم کے بجائے اس تعلیمی نظام میں پڑھائے جانے والے علوم کو فوقیت اور ترجیح دی جاتی ہے۔ تعلیمی نظام کے ان اداروں کے ذریعے سرمایہ دارانہ عقلیت کو جوازِ عمومی اور قبولیت عامہ فراہم کی جارہی ہے۔

اب تک سرمایہ دارانہ اقتدار کے حامل جن افراد، گروہوں اور اداروں کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں اہمیت کے لحاظ سے کوئی ترتیب قائم نہیں کی گئی بلکہ ان کا محض تعارف اور خاکہ پیش کر دیا گیا ہے۔ در اصل لبرل ریاست دو مختلف دائرۂ کار میں تقسیم ہو جاتی ہے: جمہوری طرز حکومت اور آمرانہ (Authoritarian) طرزِ حکومت۔ جمہوری طرزِ حکومت میں ان اداروں کی تقدیم اور ترتیب اس سے مختلف ہوتی ہے جو آمریت میں ہوتی ہے۔ ذیل میں جمہوری طرزِ حکومت کی ممکنہ ترجیحی ترتیب کی فہرست دی جاتی ہے:

بینک اور فنانشل ادارے، فنانشل ریگولیشن کے ادارے، انٹلیکچوئل / دانشور، استعماری ایجنٹ / کارندے، میڈیا، عدالتیں، بین الاقوامی نگراں ایجنسیاں، عالمی ریٹنگ ایجنسیاں، مقننہ، پولیس، آرمڈ فورسز، ٹریڈ یونینیں۔

جبکہ آمریت یا Authoritarian ریاست میں ممکنہ ترجیحی ترتیب ذیل کے مطابق ہو سکتی ہے:

پولیس، آرمڈ فورسز، استعماری ایجنٹ، عدالتیں، میڈیا، انٹلیکچوئل، بینک اور فنانشل ادارے، فنانشل ریگولیشن کے ادارے، بین الاقوامی نگراں ایجنسیاں، مقننہ۔

اب تک جن اداروں اور افراد کا تذکرہ کیا گیا ہے، ان کے بارے میں یہ بات اچھی طرح سمجھ

لینا چاہیے کہ یہ افراد اور ادارے حکومت نہیں کر رہے بلکہ ان کے ذریعے حکومت کی جا رہی ہے۔ حکومت اور اقتدار اس چھوٹے سے گروپ / گروہ کا ہے جو سرمایہ دارانہ عقلیت کو پورے طور پر قبول کیے ہوئے ہے اور اس عقلیت کی عالمگیریت کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھتا ہے۔ ایسے لوگ ان تمام افراد اور اداروں، جن کا تذکرہ کیا گیا ہے، کے اندر بھی اور باہر بھی پائے جاتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ چھوٹا سا گروپ اپنی حکومت کیسے کرتا ہے؟ یہ اپنی حکومت دو طریقوں سے کرتا ہے۔

(۱) نمائندگی (Representation)

(۲) نفاذ احکام بذریعہ طاقت (Mediation)

پہلے طریقے نمائندگی (Representation) میں یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اس پر کوئی نزاع موجود نہیں ہے کہ سرمایے کی بڑھوتری ہی قدر کے تعین کا واحد پیمانہ ہے۔ سب لوگ اس کے قائل ہیں اور یہی اصول ہم کو نمائندگی کا جواز فراہم کرتا ہے۔ کیونکہ ہم ہی اس مفادِ عامہ کو فروغ دینے والی قوت ہیں اور ہم ان تمام افراد اور اداروں کے ذریعہ وہی کر رہے ہیں جس کو مقبولیت عامہ حاصل ہے لہٰذا ہمیں جو ہم کر رہے ہیں اسکا حق حاصل ہے۔ تینوں طرح کی سرمایہ دارانہ ریاستیں چاہے وہ (۱) لبرل ہوں (۲) اشتراکی ہوں (۳) قوم پرست ہوں، اس جائز نمائندگی کا دعوی کرتی ہیں۔

نفاذ احکام بذریعہ طاقت (mediation) کے طریقے میں سرمایے کے عمومی مفاد کی ایک خاص تعبیر غالب اشرافیہ بزور قوت نافذ کرتی ہے۔ چونکہ سرمایہ داری ایک جاہلیت ہے اور اس جاہلیت سے کسی بھی خیر کا تصور نہیں کیا جا سکتا اس لیے لا محالہ بیک وقت سرمایے کے مفاد عمومی کی مختلف جہتوں سے مختلف تعبیریں کی جاتی ہیں۔ لیکن وہ چھوٹا سا گروپ جو کہ حکومت کر رہا ہے، وہ mediation کے ذریعہ یہ باور کراتا ہے کہ سرمایہ دارانہ مفادات کا جو تصور وہ رکھتا ہے وہی درست ہے۔ اس لیے عمومی مفاد کی جو تعبیر وہ کرتا ہے اس کے تحت مختلف انفرادی سرمایہ دارانہ مفادات کی تعبیروں کی تحدید کی جائے اور سرمایے کے عمومی

مفاد کے تحفظ کے لیے اس کے تصور کے مطابق معاشرے اور ریاست کی صورت گری کی جائے۔ یہ دونوں کام بیک وقت بھی کیے جارہے ہوتے ہیں یعنی غالب اشرافیہ کی تعبیرِ مفاد عمومی کو مسلط بھی کیا جارہا ہوتا ہے اور نمائندگی کے اداروں کے ذریعہ اس مخصوص تعبیر کے حق میں رائے بھی بنائی جارہی ہوتی ہے۔ نمائندگی جن اداروں (processes) کے ذریعہ حاصل کی جاتی ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱)انٹرسٹ گروپس Interest Groups

(۲)ہیروز کی پرستش Heroes

(۳)سیاسی پارٹیاں Political Parties

(۴)ایڈمنسٹریشن اینڈ کورٹس Administration and courts

انٹرسٹ گروپس: انٹرسٹ گروپس کسی سرمایہ دارانہ حق کی طلب کی بنیاد پر لوگوں کو جمع کرتے ہیں، مثلاً پانی، صفائی وسیوریج کے مسائل، تعلیم، عورتوں پر ظلم وغیرہ وغیرہ، ظاہر ہے کہ جب اس قسم کے سرمایہ دارانہ حقوق کی بنیاد پر لوگوں کو مجتمع کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو اس میں جمع ہونے والوں کی اخلاقی اور مذہبی حالت کی بنیاد پر کوئی تخصیص روا نہیں رکھی جاتی۔ مثلاً وہ مسلمان ہے یا قادیانی یا کوئی اور، اسی طرح نمازی و پرہیز گار ہے یا زانی، شرابی اور بے نمازی، بس ان کا مخصوص سرمایہ دارانہ حق کی طلب پر متفق ہونا ضروری ہوتا ہے۔ گویا ان انٹرسٹ گروپس کے ذریعہ وہ سرمایہ دارانہ اشرافیہ جو حرص وحسد کو عالمگیر کرنا چاہتی ہے، وہ معاشرے میں نفوذ کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ سرمایہ دارانہ حقوق کو طلب کر کے سرمایہ دارانہ نظام کو ہی مستحکم کیا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں غیر سرمایہ دارانہ نظام نہیں برپا کیا جا سکتا۔

ہیروز: سائنٹیفک ہیروز ہوں یا میڈیا کے ہیروز، ان کی امیج بلڈنگ کر کے بھی معاشرہ میں نفوذ کیا جاتا ہے کیونکہ اگر یہ لوگ مقبول عام ہوتے ہیں تو سرمایہ دارانہ عقلیت بھی مقبول عام ہوتی ہے۔

سیاسی پارٹیاں: بنیادی طور پر سیاسی پارٹیاں بھی سرمایہ داری سے مختص ہیں۔ سرمایہ داری سے پہلے جو مختلف گروہ اور طبقات سیاسی عمل میں شامل ہوتے تھے ان میں اور سیاسی پارٹیوں کے درمیان مماثلتیں تو تلاش کی جا سکتی ہیں، لیکن جن معنوں میں اب سیاسی پارٹیاں خصوصاً اپوزیشن پارٹیاں وجود رکھتی ہیں ان معنوں میں سرمایہ دارانہ نظام سے پہلے سیاسی جماعتیں موجود نہیں تھیں۔ مختلف پارٹیاں ایک ہی سیاسی نظام پر بنیادی طور پر متفق ہوتی ہیں۔ اس نظام پر اصولی اتفاق کے بعد ان کے اختلافات جزوی اور فروعی ہوتے ہیں۔ یہ پارٹیاں لوگوں کو ایک اجتماعیت فراہم کرتی ہیں۔ لوگ ان کی لیڈر شپ کو اپناتے ہیں اور اپنا ایک خاص تشخص اور اپنی ایک خاص شناخت ان کے ذریعہ قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس خاص تشخص اور شناخت کے لیے اپنی توانائیاں اور صلاحیتیں صرف کرتے ہیں۔ یہ پارٹیاں سرمایہ دارانہ اشرافیہ کے نفوذ کا اہم ذریعہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان جماعتوں کی بنیادیں، شناخت اور تشخص اصولی طور پر سرمایہ دارانہ نظام کے استحکام ہی سے وابستہ ہوتے ہیں۔

ایڈمنسٹریشن اور کورٹس قانون کا نفاذ اس طریقے سے کیا جاتا ہے کہ وہ قانون غیر جانبدار نظر آئے۔ فیصلے ایسے ہوں کہ وہ مفاد عامہ کو مد نظر رکھتے ہوئے غیر جانبدارانہ طور کیے جائیں تاکہ سرمایہ دارانہ نظام پر ایمان متزلزل نہ ہو اور کسی غیر سرمایہ دارانہ نظام کی جانب جھکاؤ نہ ہو۔

سرمایہ دارانہ تحریکیں سرمایہ دارانہ تحریکیں مثلاً قوم پرست، اشتراکی یا انارکسٹ تحریکیں سرمایہ دارانہ اشرافیہ کے نفوذ کا اہم ذریعہ ثابت ہوئی ہیں کیونکہ ان میں بھی غیر سرکاری تنظیموں (NGOs) اور پروفیشنلز ایسوسی ایشنز اور انٹرسٹ گروپس کی طرح سرمایہ دارانہ حقوق کو ہی طلب کیا جاتا ہے۔ ان تحریکوں کے نتیجے میں سرمایہ دارانہ اشرافیہ ہی کی سبقت قائم کی جاتی ہے اور سرمایہ دارانہ عقلیت ہی عمومیت اختیار کرتی ہے۔ قوم پرست اور اشتراکی تحریکیں لبرل سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف بڑی کامیاب تحریکیں رہی ہیں لیکن انہوں نے بھی لبرل سرمایہ داروں کی جگہ قوم پرست اور اشتراکی سرمایہ داروں کی حاکمیت

قائم کی ہے، کوئی غیر سرمایہ دارانہ نظام نہیں قائم کیا۔

نفاذ احکام بذریعہ طاقت / رہنمائی (Mediation)

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے Mediation کے ذریعہ سرمایہ کے عمومی مفاد کی ایک خاص تعبیر کو نافذ کیا جاتا ہے Mediation مندرجہ ذیل اداروں اور طریقوں کے ذریعے کی جاتی ہے۔

(۱) فوج و پولیس

(۲) کورٹس اور عدلیہ کا نظام

(۳) شمولیت (سیاسی مخالفین کو ساتھ ملانا)

(۴) اخراج کر دینا (مخالفین کو بے دست و پا کر دینا)

(۵) سوشل ویلفیئر

(۶) صنعتی تعلقات

ایک خاص قسم کے ڈسپلن کو نافذ کرنے کے لیے سب سے اہم ادارے تو پولیس اور فوج ہیں۔ اس کے علاوہ کورٹس اور عدلیہ کا نظام ہے۔ یہ اس لیے اہم ہیں کہ سرمایہ دارانہ عقلیت میں راسخ العقیدہ لوگ جو فیصلے کرتے ہیں اس میں یہ کوشش کی جاتی ہے کہ وہ فیصلے مقبول عام بھی ہوں۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی بہت اہم ہے اور اس بات کو بھی ممکن بنایا جاتا ہے کہ اگر ان فیصلوں کے خلاف کوئی رد عمل ہو تو ان کو سزا بھی دی جا سکے۔ اس کے لیے مذکورہ ادارے بہت اہمیت کے حامل ہیں۔

شمولیت (Cooptation) اس سے مراد یہ ہے کہ ایسے گروہوں کو ساتھ ملا لیا جائے جو کسی طرح راہ میں رکاوٹ بن سکتے ہوں اور جو سرمایہ دارانہ نظام کے مخالف گروپ نظر آتے ہوں۔ سرمایہ دارانہ نظام میں "شمولیت" کی ایک بہترین مثال سوشل ڈیموکریسی کی ہے۔ سوشل ڈیموکریسی کے ذریعہ سوشلسٹ طرزِ فکر کے حاملین کو اس بات کا قائل کر لیا جاتا ہے کہ وہ سرمایہ دارانہ نظام میں محدود حقوق کی طلب پر اکتفا کر لیں۔ اس کے نتیجے میں میں مزدور نے اپنی جدوجہد اس پر مرکوز کر دی کہ اس نظام یعنی سرمایہ دارانہ نظام میں میرا وہ

حصہ مجھے نہیں دیا جارہا جس کا میں حق دار ہوں لہٰذا مزدوروں کی جماعت کو حکومت میں شامل کر لیا جائے۔ اس طرح محدود حقوق فراہم کر کے اور مراعات فراہم کر کے بڑی جدوجہد یعنی تبدیلیٔ نظام کی جدوجہد سے ان کو دست کش کروالیا جاتا ہے۔

cooptation کی اور بھی مثالیں ہو سکتی ہیں مثلاً اسلامی جماعتوں کو بھی اگر سرمایہ دارانہ حکومت میں شامل کر لیا جائے تو وہ سرمایہ دارانہ نظام ریاست کا ایک جواز فراہم کر سکتی ہیں اور اسلامی امارت و خلافت کی جدوجہد سے دست کش ہو سکتی ہیں اور اس بات پر راضی ہو سکتی ہیں کہ محدود مراعات حاصل کر لیں اور معمولی اور بے ضرر قسم کے علاماتی اسلامی اقدامات پر مطمئن ہو جائیں۔ اس cooptation سے co-opt ہونے والا گروہ اپنے فطری حلقے Constituency سے دور ہوتا چلا جاتا ہے اور اس حلقے Constituency میں اپنا جواز legitimacy کھو دیتا ہے۔

اخراج (Exclusion): سرمایہ دارانہ نظام میں معاشی عمل اور سیاسی عمل اس طرح ترتیب دیا جاتا ہے کہ قوت ان ہاتھوں میں مرتکز ہوتی چلی جاتی ہے جو سرمایہ کی بڑھوتری کے اصول کو بنیادی عقیدہ بنا لیتے ہیں اور جو یہ عقیدہ نہیں رکھتے انہیں اس قابل نہیں رہنے دیا جاتا کہ وہ مجموعی سیاسی یا معاشی عمل میں کوئی فیصل کردار ادا کر سکیں، مثلاً صوفیائے کرام کی معاشرتی اور ریاستی حیثیت کو اس نہج پر پہنچا دیا گیا ہے کہ وہ سرمایہ داری کے خلاف کوئی فیصل کردار ادا نہ کر سکیں۔

سوشل ویلفیئر: آخری چیز سوشل ویلفیئر ہے یعنی رفاہ عامہ کے کاموں پر ہی ساری جدوجہد کو مرکوز کر دیا جائے اور عوام کو سیاستِ عالی کے معاملات سے ہٹا دیا جائے۔ مرکزی معاملہ یہی رہ جائے کہ رفاہ عامہ کے کتنے کام ہو رہے ہیں؟ اسی طرح سوشل ویلفیئر سسٹم اور نیشنل انشورنس کا پورا نظام ہے جس کے ذریعے سرمائے کے عمومی مفاد کی ایک خاص تعبیر کے نفاذ کو ممکن بنایا جاتا ہے۔ یہ وہ طریقے ہیں جن سے سرمایہ دارانہ نظام وضبط / ڈسپلن قائم رکھا جاتا ہے۔

بطور نمائندگی جن اداروں اور طریقہ ہائے کار کا تذکرہ ہوا اور بطور طاقت و رہنمائی Mediation جن اداروں اور طریقہ ہائے کار کا تذکرہ ہوا ان کو جمہوری حکومتوں میں بھی بروئے کار لایا جا سکتا ہے اور استبدادی (ڈکٹیٹر شپ) حکومتوں میں بھی بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔

ذیل میں وہ مختلف ترتیبات بیان کی جاتی ہیں جو میرے خیال میں مختلف طرز کی حکومتوں میں ممکن ہیں۔ نمائندگی کے ادارے اگر جمہوری حکومت میں ہوں تو ان کی مندرجہ ذیل ترتیب ہو سکتی ہے:

انٹرسٹ گروپس، سیاسی جماعتیں، ہیروز، انتظامیہ، کورٹس

نمائندگی کے اداروں کی ترتیب استبدادی حکومت میں مندرجہ ذیل طریقے سے ممکن ہے:

عوامی تحریکیں، ہیروز، انتظامیہ، کورٹس، انٹرسٹ گروپس

اسی طرح Mediation کے اداروں کی ترتیب جمہوری حکومت میں مندرجہ ذیل ہو سکتی ہے:

کورٹس اور عدلیہ کا نظام، شمولیت (Mediation)، سوشل ویلفیئر، اخراج، پولیس اور فوج

اس کے علاوہ Mediation کے اداروں کی ترتیب استبدادی حکومتوں میں یوں ممکن ہے:

کورٹس اور عدلیہ کا نظام، پولیس اور فوج، اخراج، شمولیت، سوشل ویلفیئر

اب تک سرمایہ دارانہ ریاست کا ایک عمومی خاکہ مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر ہم کسی جگہ اسلامی نظام کو غالب کرنا چاہتے ہیں تو وہاں سے سرمایہ دارانہ نظام کا کلیتاً انہدام ضروری ہے کیونکہ اسلامی نظام اور سرمایہ دارانہ نظام میں اختلاف جزوی نہیں بلکہ اصولی اور بنیادی ہے۔

اسلامی نظام کی پیش قدمی اور سرمایہ دارانہ نظام کا کسی مخصوص ملک سے اخراج کس طرح ممکن ہو گا اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے مخصوص ملک میں سرمایہ داری اور اس کی مخصوص نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اگر ہم پاکستان میں ایسی اقدامی حکمت عملی ترتیب

دینا چاہتے ہیں اور پیش قدمی کرنا چاہتے ہیں تو دینی تحریکوں کو مندرجہ ذیل سوالوں کے جوابات حاصل کرنا ضروری ہے:

(۱) پاکستانی ریاست کی نوعیت کیا ہے؟

(۲) کیا پاکستان ایک قومی لبرل ریاست ہے یا استعماری باجگزار ریاست یا دونوں کا مجموعہ ہے؟

(۳) پاکستان میں سرمایہ دارانہ عقلیت غالب کرنے کے لئے کون سے ادارے کلیدی اور کون سے معاونین کی حیثیت رکھتے ہیں؟

(۴) کیا ان کلیدی اور معاونین گروپس میں تعلق مفاہمت کا ہے یا مخاصمت کا؟ اور مخاصمت کی صورت میں اس کی نوعیت کیا ہے؟

(۵) طرزِ حکومت کی ترجیحات اور قوتِ نافذہ کے استعمال کے تناظر میں کیا پاکستان ایک لبرل جمہوری ریاست ہے یا آمرانہ؟

(۶) سرمایہ داری کے استحکام اور فروغ کے لیے پاکستان میں بحیثیت قومی لبرل ریاست یا باجگزار ریاست کیا بنیادی فیصلے ہو رہے ہیں؟

(۷) ان فیصلوں کے صدور اور نفاذ کے لیے کون سے ادارے، افراد اور پروسیسس (processes) اہمیت کے حامل ہیں؟

(۸) کن افراد یا کن عہدوں کی سطح پر کلیدی فیصلے کیے جاتے ہوں اور وہ کیا اسٹرکچرز ہیں جن سے ان کی تنفیذ کو ممکن بنایا جاتا ہے؟

(۹) بیوروکریسی میں فیصلہ کرنے کی اہم ترین سطح کیا ہے اور ان فیصلوں کی تنفیذ کی اہم ترین سطح کیا ہے؟

(۱۰) کون سے ادارے اور کون سے عوامل ہیں جن کو کمزور کر کے سرمایہ دارانہ تعقل کو غیر معقول کیا جا سکتا ہے؟

ہم انشاء اللہ اسلامی انقلاب کے اگلے شماروں میں ان سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کریں گے۔

کیا ریاست جدیدیت و سرمایہ داری کی اختراع ہے؟

ریاست کی ماہیت پر ایک نظری و تنقیدی جائزہ

علی محمد رضوی
mudeerislamiinqilab@gmail.com

ابتدائیہ

ریاست انسانی اجتماعیت کی ایک خاص اور منفرد شکل ہے۔ یہ محض افراد کا کوئی اتفاقی یا عارضی اجتماع نہیں، بلکہ ایک باقاعدہ اور منظم ادارتی صف بندی کا نام ہے جیسے قوانین، انتظامی ڈھانچہ اور وہ طاقت جو اس کے فیصلوں کو نافذ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

جب سے انسانی معاشرے اس دنیا میں وجود میں آئے ہیں، کسی نہ کسی صورت میں ریاست کا تصور موجود رہا ہے۔ اگرچہ اس کی شکلیں وقت اور حالات کے ساتھ بدلتی رہی ہیں، لیکن انسانی گروہوں کو منظم کرنے اور ان پر اختیار قائم کرنے کی ضرورت ہمیشہ محسوس کی گئی ہے۔

یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ریاست اور معاشرہ دو مختلف لیکن باہم مربوط تصورات ہیں۔ معاشرہ انسانی اجتماعیت کی ایک وسیع تر شکل ہے، جس میں افراد کے تمام باہمی تعلقات، رسم و رواج، اور سماجی ادارے شامل ہیں۔ دوسری طرف، ریاست انسانی اجتماعیت کی ایک مخصوص سیاسی تنظیم ہے جو معاشرے پر جبری اختیار رکھتی ہے۔ ریاست کا بنیادی کام معاشرے کے اندر نظم و ضبط برقرار رکھنا، امن و امان قائم کرنا، اور اجتماعی اہداف کو مقرر کرنا، ان پر اجماع قائم کرنا اور ان کے حصول اور تحفظ کے لیے مسلسل تگ و دو کرنا شامل ہے۔ اس طرح، ریاست انسانی اجتماعیت کی ایک ایسی منظم اور اداراتی شکل ہے جو معاشرے کے اندر ایک خاص کردار ادا کرتی ہے۔

معاشرہ اپنی بنیاد میں ایک رضاکارانہ ساخت رکھتا ہے، جہاں افراد اپنی مرضی اور باہمی

رضامندی سے مختلف قسم کے تعلقات استوار کرتے ہیں۔ یہ روابط خاندانوں، دوستیوں اور برادریوں کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، جن میں اختیار کی بنیاد باہمی محبت، اخوت اور رضامندی پر قائم ہوتی ہے۔ اس کے برعکس، ریاست ایک نظام اقتدار کی حیثیت رکھتی ہے جو ایک مخصوص معاشرے پر اپنی حاکمیت قائم کرتی ہے۔ ریاست کی بنیادی شناخت اس کی جبری طاقت ہے، جس کے ذریعے وہ قوانین نافذ کرتی ہے اور اپنے باشندوں کو ایک جبری صف بندی میں منسلک کرتی ہے۔ یوں، معاشرے کی رضاکارانہ ماہیت اور ریاست کی جبری ساخت میں ایک واضح اور بنیادی فرق موجود ہے۔

ریاست کی جبری ساخت کے متعلق یہاں یہ اہم بات سمجھ لینی چاہیے کہ ریاست کے جبر کو عموماً اس کے باشندے جائز سمجھتے ہیں۔ اگر ریاست کے جبر کو ایک متعدد بہ افراد جائز نہ سمجھیں تو ایسی ریاست کو مستحکم ریاست نہیں قرار دیا جاسکتا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ بطورِ فرضی خاکے / آئیڈیل ٹائپ کے یا بطورِ ماہیت، ریاست کے تصور میں ایک کلیت ہے۔ ریاست اپنے آپ کو اپنے دائرۂ کار میں وحدہ لاشریک یا بلاشرکت غیر حکمران جانتی ہے (اسی وجہ سے حضرت مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے ریاست کو اس ماہیتی اعتبار سے دین کے ہم معنی قرار دیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ دین کو ریاست کے برابر قرار دے رہے تھے یا دین اور ریاست کو ایک حقیقت سمجھ رہے تھے بلکہ وہ اس کلیت کی طرف اشارہ کر رہے تھے جو دین کے اسلامی تصور اور ریاست کے تصور کے درمیان قدرِ مشترک ہے)۔

اس اصولی کلیت پر قدغن دو طرح سے ہو سکتی ہے:

پہلی بات یہ ہے کہ یہ ہو سکتا ہے کہ ریاست فی الواقع کمزور ہو اور دوسری مخالف قوتوں کو گنجائش دینے پر اپنے آپ کو مجبور پاتی ہو۔ اس لیے نہیں کہ وہ اصولی طور پر اس گنجائش کو قبول کرتی ہے بلکہ اس لیے کہ وہ اتنی قوی نہیں کہ اپنی کلیت کو کماحقہ لاگو کر سکے۔ ان معنوں میں کوئی ریاست فی الواقع نظری کلیت کا کماحقہ اطلاق نہیں کر سکتی۔ مگر نظری کلیت کا اطلاق (application) ایک واقعیتی حقیقت ہے اصولی حقیقت نہیں ہے۔

بہر حال ریاست کی واقعیتی کمزوری کی بنیاد پر یہ غلط نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ مثلاً زمانۂ جدید سے ماقبل کی ریاستیں اس اصولی کلیت کے قائل نہیں تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قرون وسطی کی ریاستیں اور قدیم ریاستیں عموماً اس کلیت کے نفاذ میں اپنے آپ کو اکثر ناکام پاتی تھیں کیونکہ ان کی مخالف قوتیں پوری طرح ان کے زیر نگین نہیں تھیں اور اپنے آپ کو اس بات پہ مجبور پاتی تھیں کہ ان کو گنجائش دیں لیکن یہ ایک واقعیتی گنجائش تھی جس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ قرون وسطی کی ریاستیں اور قدیم ریاستیں کلیت کی متلاشی نہ تھیں۔ اگرچہ خود مختاری کا عملی اطلاق اکثر جدید قومی ریاست کی نسبت زیادہ منقسم اور کم مطلق تھا، تاہم واحد، بالادست اختیار کا دعویٰ یا تمنا عموماً موجود تھی۔ عملی طور پر، قبل از جدید ریاستوں کو اکثر اپنی کلی و یگانہ حاکمیت کے لیے طاقتور امراء، مذہبی اداروں (مثلاً، قرون وسطیٰ کے یورپ میں چرچ)، نیم خود مختار شہروں یا حتیٰ کہ حریف قبائلی گروہوں سے چیلنجز کا سامنا رہتا تھا۔ مثال کے طور پر، جاگیر دارانہ نظام میں دائرۂ اختیار کی حدود اور اختیارات کا اشتراک تھا۔ لیکن ان چیلنجز کے باوجود، بادشاہ، شہنشاہ اور خلفاء عام طور پر اپنی مملکت میں اپنی حتمی حاکمیت کا دعویٰ کرتے تھے۔ وہ ٹیکس لگانے، فوجیں کھڑی کرنے، انصاف فراہم کرنے، اور جنگ چھیڑنے کے حق کو اپنا خصوصی استحقاق سمجھتے تھے۔

مزید برآں اگرچہ (مثلاً قرون وسطی میں) "نجی" فوجیں موجود تھیں (مثلاً جاگیر دارانہ دستے)، لیکن بادشاہ یا شہنشاہ کا مثالی طور پر یہ دعویٰ و تمنا تھی کہ وہ جائز تشدد کا حتمی ماخذ ہو۔ اس اجارہ داری کو لاحق خطرات (مثلاً، نجی جھگڑے، ڈاکوؤں یا خود مختار سرداروں) کو ریاست کے وجود کے لیے خطرہ سمجھا جاتا تھا اور اکثر ان کا مقابلہ شدید جبر سے کیا جاتا تھا۔

یہاں تک کہ جب عملی گرفت محدود ہوتی تھی اس وقت بھی حکمران کی علامتی برتری اور حتمی قانونی حاکمیت (اگرچہ نہ چاہتے ہوئے ہی کیوں نہ ہو) کو اکثر تسلیم کیا جاتا تھا۔ قرون وسطیٰ اور ابتدائی جدید تاریخ میں زمین، انصاف اور فوجی وسائل پر مکمل گرفت کے لیے بادشاہوں اور امراء کے درمیان مسلسل کشمکش ریاست کی اپنی "واحد" حاکمیت کو مستحکم

کرنے کی جاری کوشش کو واضح کرتی ہے۔ یورپ میں مرکزی بادشاہتوں کا عروج درحقیقت اندرونی حریف طاقتوں پر اس حتمی خود مختاری کو قائم کرنے کا عمل تھا۔

پس، اگرچہ جوازیت (legitimacy) حاصل کرنے کے طریقۂ کار اور مرکزی غیر متنازعہ طاقت کی پہنچ عموماً جدید دور سے نمایاں طور پر مختلف تھی، تاہم ریاست کے جبر کو جائز سمجھے جانے کی بنیادی ضرورت اور اپنے معاشرے میں حتمی دسترس اور اقتدار کی تمنائے واقعی قبل از جدید ریاستوں کے کام اور استحکام کے لیے بنیادی تھی۔ قبل از جدید دور کی اصل کشمکشیں اور اختراعات اکثر انہی مسائل ورکاوٹوں کے گرد گھومتی تھیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہر ریاست اپنی اندرونی نظریاتی و تعقلی تقاضوں کی بنیاد پر اپنی وسعت کے دائروں میں لوگوں کو آزادئ کار دیتی ہے لیکن عموماً اس آزادئ کار کے اصول وضوابط اور عمومی قواعد ہوتے ہیں۔ اس اندرونی آزادی کو ریاست کی کلیت کے خلاف یا اس سے دستبرداری نہیں کہا جاسکتا کیونکہ یہ آزادی ریاست کے اندرونی تقاضوں کے مطابق ہوتی ہے اور ہمیشہ مشروط ہوتی ہے۔ یہاں اس کی دو مثالیں دی جاسکتی ہیں: موجودہ لبرل ریاست کلی (all encompassing & totalising) ریاست ہے۔ لیکن وہ اس کلی ریاست ہونے کہ باوجود افراد اور اداروں کو ایک گونہ آزادی دیتی ہے لیکن یہ آزادی اس کی اندرونی نظریاتی ریشنلٹی اور ٹیکنیکل ریشنلٹی کا تقاضا ہے نہ کہ اس کی دلیل ہے کہ لبرل ریاست کلی نہیں ہے۔ دوسری مثال لبرلزم کے بالکل برعکس ہے۔ اسلام بطور دین ایک کلی نظام و تہذیب ہے۔ یہ امر نصوص قطعیہ سے ثابت ہے جس میں کوئی ریب نہیں۔ دوسری طرف اس کلیت کے اندر افراد اور اداروں کو آزادئ کار بھی دی گئی ہے۔ مثلاً جن معاملات میں براہ راست نصوص نہیں ہیں اس میں نہ صرف یکہ اجتہاد کی اجازت بلکہ اس کا حکم ہے۔ لیکن اس سے یہ سمجھنا کہ اسلام ان معاملات میں اپنی کلیت سے دستبردار ہو گیا ہے ایک فاش غلطی ہے۔ ہمارے دین نے یہ وسعت اپنے اندرونی تعقل کے تقاضوں کے تحت نہ کہ کلیت سے دستبرداری کی بنیاد پر دی ہے۔ جن لوگوں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے اور سمجھا ہے کہ اسلام

میں ایک طرح کا محدود لبرلزم ہے ان کو یہی غلط فہمی ہوئی ہے۔

ان دونوں مثالوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کلی نظام اپنی کلیت سے دستبردار ہوئے بغیر اپنے اندرونی تعقل کے تقاضوں کے مطابق اپنی کلیت کے اندر افراد اور اداروں کو توسع دینے کے مجاز ہیں۔

اوپر کی بحث سے چند مزید باتیں واضح ہوتی ہیں:

ریاست کی حقیقت محض شخصیات و اداروں پر منحصر نہیں ہوتی بلکہ ریاستی ریشنلٹی / تعقل (جسے بعض جدید محققین حکومتی تعقل یا حکومتی ریشنلٹی بھی کہتے ہیں) ریاست کی شہ رگ ہے کیونکہ ریاستی تعقل ہی ریاستی جبر کو جواز فراہم کرتا ہے۔ اس لیے ہر ریاست کا ایک اہم فرض یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی ریاستی ریشنلٹی کی مسلسل پیدائش و پرورش (produce & reproduce) کرتی رہے اور اس کا دفاع کرتی رہے۔ زمانۂ قدیم سے بادشاہ اور حکمران جو شاعروں اور علماء کو جائیدادیں دیتے تھے اور ان کے روزینے مقرر کرتے تھے اس کی ایک بہت بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ اس ریاستی تعقل کے نگہبان تھے۔ ان درباریوں کا یہ کام تھا کہ وہ ایک مخصوص ریاستی تعقل کی آبیاری کریں، اس کی مسلسل پرورش کریں، اس کا مخالف تعقلات کے مقابلے میں دفاع کریں اور یہ ناممکن بنائیں کہ کوئی اور ریاستی تعقل مقبول عام ہونے پائے۔ یہ محض آج کے دور کا شاخسانہ نہیں ہے بلکہ ایک پرانی داستان ہے۔

اس بحث سے اہم مغالطوں کا رد ہوتا ہے جس کی بنیاد پر بعض لوگوں نے دعویٰ کیا ہے کہ ریاست ایک جدید چیز ہے اور وہ ماقبل جدید دور میں موجود نہیں تھی اور اگر موجود تھی بھی تو جوہری طور پر جدید ریاست سے مختلف تھی۔

ایک دعویٰ یہ ہے کہ جدید ریاست کی بنیاد بے نامی (anonymity) پر ہے جس کے لیے تنظیمی ٹیکنالوجی زمانۂ قدیم میں یا ماقبل جدید دور میں موجود نہیں تھی۔ اس لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ ماقبل جدید دور میں ریاست بمعنی جدید تصور وجود میں آسکتی۔ اس سلسلے میں بعض محققین کے نزدیک کارپوریشن اور شخصِ قانونی کے تصورات اہم سنگ میل تصورات تھے جو

جدید دور سے پہلے موجود نہ تھے۔ ان تصورات کے بغیر جدید بے نام ریاست حکومت سے ممیز ہستی کے طور پر معرض وجود میں نہیں آسکتی تھی۔

لیکن ایک بات تو یہ ہے کہ یہ دعویٰ غلط ہے کہ کارپوریشن اور شخص قانونی کے تصورات بالکل نئے ہیں جو زمانۂ قدیم میں موجود نہیں تھے۔ یہ صحیح ہے کہ سرمایہ داری نے ان تصورات کا ایک خاص استعمال کیا ہے، ان کو ایک خاص طرح سے فروغ دیا ہے لیکن سرمایہ داری کوئی چیز خود ایجاد نہیں کرتی پہلے سے موجود چیزوں کو بڑھوتری برائے بڑھوتری کے آلۂ کار کے طور پر استعمال کرتی ہے اور چیزوں کو وہاں رکھتی ہے جہاں ان کے اصل جگہ نہیں ہے یعنی ظلم کرتی ہے۔

سرمایہ داری اور جدید دور میں موجود تصورات کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ لازماً پہلے بالکل موجود نہ تھے بلکہ قدیم دور کے قوانین حتی کہ اسلامی قوانین میں بھی اس قسم کے تصورات آپ کو مل سکتے ہیں۔ ہاں یہ ہے کہ ان تصورات کا بالکل نیا استعمال بالکل ایک نئی پرورش سرمایہ دار کے دور میں ہوئی ہے اور اس کے بعد سرمایہ دارانہ ریاست کے فہم کے لیے ان تصورات کو استعمال کیا گیا، لیکن اس سے نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ سرمایہ داری سے پہلے ریاست کا وجود نہیں تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ بے نامی کے تصور کے لیے شخص قانونی اور کارپوریشن کے تصورات ناگزیر نہیں ہیں۔ ہم نے جیسا کہ اوپر واضح کیا ہے، ریاست کے وجود کے لیے جوازیت (legitimacy) اہم ترین چیز ہے۔ جوازیت کا تصور حکومت اور ریاست اور قدیم اور جدید ریاست کے تصورات کے درمیان پل کا کام دیتا ہے۔ تصوراتی طور پر جوازیت کا تصور نظریاتی اور ٹیکنالوجیکل ریشنلٹی اور تعقل کا متقاضی ہوتا ہے۔ اب تعقل خود ایک "بے نام" (subject-less) چیز ہے۔ گو کہ زبان کی طرح تعقل کا وجود افراد کے وجود کے بغیر ناممکن ہے، لیکن یہ بھی درست ہے کہ جب وہ ایک بار وجود میں آجاتا ہے تو اس کی ایک مجرد شکل ہوتی ہے جو شخص قانونی اور کارپوریشن کی طرح خود ایک حقیقت بن جاتی ہے۔ اس کی طرف

چیزیں منسوب کی جاتی ہیں اور کی جا سکتی ہیں۔ پس محض شخص قانونی اور کارپوریشن کا وجود ریاست کے وجود کے لیے ضروری یا ناگزیر نہیں ہے۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا بہت سے سیاسی محققین کا دعویٰ ہے کہ "ریاست" بطور تصور اور ایک سیاسی حقیقت، اپنی مخصوص خصوصیات کے ساتھ، ایک جدید تشکیل ہے جو بنیادی طور پر ابتدائی جدید یورپ میں ابھری۔ لیکن اس دعوے کی دو تعبیرات ممکن ہیں۔ ایک کو ہم قوی تعبیر جبکہ دوسری کو ضعیف تعبیر کہہ سکتے ہیں۔ ان محققین کا دعویٰ یہ نہیں ہے کہ جدید ریاست سے پہلے سیاسی تنظیم موجود نہیں تھی۔ دعویٰ یہ ہے کہ جدید ریاست سے پہلے ایک مخصوص معنوں میں ریاست موجود نہیں تھی۔ دعویٰ یہ بھی نہیں ہے کہ جدید دور سے پہلے سرمایہ دارانہ اور قومی ریاست موجود نہیں تھیں (جو کہ ایک درست دعویٰ ہو گا)۔ دعویٰ یہ ہے کہ کم از کم ایک اہم اعتبار سے جدید ریاست سے پہلے ریاست ہی موجود نہ تھی۔ صرف یہی آخری دعویٰ دلچسپ اور معنی خیز دعویٰ ہے اور ہم اسی دعوے کی تردید کرتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ "ریاست ایک جدید سیاسی تشکیل ہے"، تو کہنے والوں کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ:

- جدید دور سے پہلے کوئی سیاسی برادریاں موجود نہیں تھیں۔
- جدید دور سے پہلے کوئی حکمران، قوانین، یا طرز حکمرانی نہیں تھے۔
- جدید دور سے پہلے لوگ منظم معاشروں میں نہیں رہتے تھے۔

بلکہ ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سیاسی تنظیم کی وہ مخصوص شکل اور تصور جسے اب ہم عام طور پر "ریاست" کہتے ہیں، اپنی مکمل ترقی یافتہ حالت میں جدید دور سے پہلے موجود نہیں تھا۔

اس قوی تعبیر کے مقابلے میں ضعیف یا کمزور تعبیر میں کوئی اہم بات نہیں کہی جا رہی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ضعیف تعبیر میں چونکا دینے والی وہ قوت نہیں ہے جو قوی تعبیر میں موجود ہے۔

آیئے اس قوی تعبیر کی "چونکا دینے والی قوت" کو سمجھتے ہیں:

۱. "کمزور" تشریح (جو قوت کھو دیتی ہے): اگر کوئی اسے محض اس طرح سمجھے کہ "سیاسی وجود پہلے بھی تھے، لیکن انہیں اس وقت "ریاست" نہیں کہا جاتا تھا"، تو جیسا کہ ہم نے پہلے نشان دہی کی ہے، اس دعوے کی زیادہ تر قوت ختم ہو جاتی ہے۔ یہ اصطلاحات کے بارے میں ایک معنوی بحث بن کر رہ جاتی ہے، نہ کہ سیاسی ارتقاء کے بارے میں کوئی ٹھوس دعویٰ۔

۲. "قوی" تشریح (جہاں قوت مضمر ہے): اس دعوے کی "چونکا دینے والی قوت" اس دلیل میں ہے کہ جدید ریاست مخصوص، باہم مربوط خصوصیات کا ایک مجموعہ رکھتی ہے جو پہلے کے سیاسی وجود میں موجود نہیں تھا، یا کم از کم اسی طرح یکجا اور ادارتی شکل میں موجود نہیں تھا۔

ان خصوصیات میں مندرجہ ذیل چیزیں شامل ہیں:

- تجریدی کارپوریٹ شخصیت: یہ تصور کہ ریاست اپنی ایک قانونی شخصیت رکھتی ہے جو حکمران، حکومت یا عوام سے الگ ہے۔ یہ ایک مستقل، تجریدی قانونی وجود ہے جو خود مختاری رکھتا ہے۔ پہلے کی شکلوں میں اکثر حکمران کو مملکت کے ساتھ خلط ملط کر دیا جاتا تھا (مثلاً، "میں ہی ریاست ہوں")۔
- مطلق اور ناقابل تقسیم خود مختاری: یہ تصور کہ اعلیٰ، غیر منقسم اختیار ریاست کا مخصوص استحقاق ہے جو اندرونی طور پر (اپنے رعایا پر) اور بیرونی طور پر (اپنی سرزمین پر، بیرونی مداخلت سے آزاد) بلا شرکت غیرے حکمران ہوتا ہے۔ قبل از جدید نظاموں میں اکثر متداخل دائرۂ اختیار، بکھرے ہوئے اندرونی اختیار (مثلاً، جاگیرداری)، اور بیرونی اختیار (مثلاً، کلیسا) ہوتے تھے۔
- مستقل علاقائی حدود: ریاست کا وجود واضح طور پر متعین، نشان زدہ، اور نسبتاً مستحکم سرحدوں کا متقاضی ہے۔ پہلے کی سلطنتوں کی سرحدیں اکثر سیال اور اثر و رسوخ کے دائرے ہوتے تھے نہ کہ سخت حدود۔

- غیر شخصی بیوروکریسی اور عقلی- قانونی اختیار: حکمرانی رسمی، غیر شخصی اداروں اور قواعد کے ذریعے انجام پاتی ہے، نہ کہ ذاتی وفاداریوں، سرپرستی، یا کسی بادشاہ کی براہ راست مرضی سے۔ یہ میکس ویبر کا عقلی- قانونی اختیار کا تصور ہے۔
- قانونی طاقت یا قوت پر اجارہ داری: ریاست کو اکیلے ہی اپنی سرزمین کے اندر قوت / طاقت کے استعمال کا حق حاصل ہے، اور وہ اسے اپنی پولیس، فوج، اور قانونی نظام کے ذریعے نافذ کرتی ہے۔ پہلے کے ادوار میں نجی فوجیں، جاگیر دار سردار، حتیٰ کہ مذہبی ادارے بھی جبر کی اہم طاقت ہوتے تھے۔

یہ سب "چونکا دینے والی تعبیر" کے لیے کیوں اہم ہے:

"چونکا دینے والی تعبیر" یا قوی تعبیر محض نام کی تبدیلی کے بارے میں نہیں ہے۔ یہ اس بارے میں ہے کہ خصوصیات کے اس منفرد امتزاج نے جس کا اوپر تذکرہ ہوا، سیاسی زندگی، باشندگی، بین الاقوامی تعلقات، اور افراد اور حکم و اختیار کے درمیان تعلقات کو بنیادی طور پر کیسے از سر نو بالکل نئی طرح سے تشکیل دیا ہے۔

۱. اس کا مطلب یہ ہے کہ سیاسی نظم کا مسئلہ، سیاسی طاقت کی نوعیت، اور جدید دنیا میں سیاسی وجودوں سے منسلک توقعات قبل از جدید دور کے مقابلے میں جوہری طور پر مختلف ہیں۔

۲. اس کا مطلب یہ ہے کہ جدید ریاستی تصورات کو قدیم سلطنتوں یا قرون وسطیٰ کی بادشاہتوں پر لاگو کرنا غیر مناسب ہو سکتا ہے، جس سے ان کی حقیقی نوعیت کو سمجھنے میں غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔

۳. یہ تعبیر جدید ریاست کے مخصوص تاریخی-حادثاتی پہلو کو نمایاں کرتی ہے۔ یہ تعبیر یہ تجویز کرتی ہے کہ یہ سیاسی ارتقاء کا کوئی فطری یا ناگزیر انجام نہیں ہے، بلکہ بہت سے امکانات میں سے ایک امکان ہے۔

لہٰذا، ہم یہ کہنے میں بجا ہیں کہ ان محققین کے دعوے کی قوت اس بات پر منحصر ہے کہ وہ

سیاسی طاقت اور تنظیم کی ایک مخصوص، تاریخی، اتفاقی شکل کے بارے میں بات کر رہے ہیں، پرانی شکلوں کے محض ایک نئے اظہار کے بارے میں بات نہیں کر رہے ہیں۔ "چونکا دینے والی تعبیر" کا بنیادی خیال یہ ہے کہ یہ بظاہر ہر جگہ موجود اور فطری وجود (ریاست) درحقیقت ایک نسبتاً حالیہ انسانی ایجاد ہے جو خصوصیات کا ایک الگ مجموعہ ہے جو اسے بنیادی طور پر اس سے پہلے آنے والی تمام سیاسی تنظیموں سے ممتاز کرتا ہے۔

آیئے اب ان دلائل کا مختصر جائزہ لیتے ہیں:

ہم مضمون کے آغاز میں یہ بات تفصیل سے کہہ آئے ہیں کہ ریاستی دعووں کی نظریاتی کلیت اور ان کی زمینی حقیقت کے درمیان امتیاز کرنا ناگزیر ہے۔ یہ بات صرف حاکمیت یا خود مختاری پر ہی لاگو نہیں ہوتی، بلکہ ریاست کے ہر دعوے پر صادق آتی ہے۔ ایک ریاست کی واقعیتی کمزوری کسی طور پر بھی اس کی اپنے نظریاتی دعووں سے دستبرداری کا اشارہ نہیں ہوتی۔ یہ ممکن ہے کہ وہ ایک مشکل دور سے گزر رہی ہو، لیکن اس کے بنیادی اصول اور دعوے برقرار رہتے ہیں۔

دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ یہ دعوے ہمیشہ صریح نہیں ہوتے؛ بلکہ اکثر اوقات وہ مضمر شکل میں موجود ہوتے ہیں۔ یہ مضمر دعوے ریاست کے افعال، اس کی پالیسیوں اور بین الاقوامی تعلقات میں جھلکتے ہیں۔ ایک ریاست کی طاقت کا اندازہ صرف اس کے واضح اعلانات سے نہیں لگایا جاسکتا، بلکہ اس کی گہرائی میں موجود غیر علانیہ ارادوں اور عملی اقدامات سے بھی اس کی حقیقت آشکار ہوتی ہے۔

تیسری بات بھی پہلے گزر چکی ہے کہ ریاست کا اپنی اندرونی ماہیت اور تعقل کی بنیاد پر افراد اور اداروں کو اختیار دینا لازماً محض ایک حکمت عملی نہیں ہوتی۔ ایک لبرل ریاست کا چرچ کو آزادی دینا یا ایک اسلامی ریاست میں اہل کتاب کے حقوق کا تحفظ کرنا دراصل ان ریاستوں کے بنیادی تعقل اور وجودی اصولوں کا لازمی تقاضا ہے۔ یہ عمل ریاست کی کلیت یا خود مختاری سے دستبرداری کے بجائے، اس کی اپنی فطرت اور نظریے کا اظہار ہوتا ہے۔ ریاست کے

اندرونی توسع کا مطلب صرف انتظامی اختیارات کی تقسیم نہیں بلکہ اس میں مخالف افراد اور اداروں کو بھی اپنی کلیت کے دائرے میں اختیارات دینا شامل ہو سکتا ہے۔ یہ بظاہر کمزوری لگے، مگر در حقیقت یہ نہ صرف ریاست کی لچک اور حکمت عملی کو ظاہر کرتا ہے تاکہ داخلی کشیدگی کو کم کیا جا سکے، بغاوتوں سے بچا جائے، اور مختلف الخیال گروہوں کو نظام میں شامل کر کے ریاست کی جوازیت (legitimacy) کو بڑھایا جائے بلکہ یہ ریاست کے اندرونی تعقل (نظریاتی و تکنیکی) کا بھی حصہ ہو سکتا ہے۔ تاہم، یہ تمام اختیارات ریاست کے بنیادی ڈھانچے اور کلیت کے تابع رہتے ہیں، جو بالآخر اسے مزید مستحکم کرتے ہیں۔

حاکمیت مطلقہ (sovereignty)، قوت و طاقت (power)، اور عنف (violence) پر ریاست کی اجارہ داری ریاست کی کلیت کا لازمی حصہ ہیں۔ حاکمیت مطلقہ، قوت اور عنف پر بلا شرکت غیرے اجارہ داری کے تصورات کا ریاست سے تعلق سمجھنے کے لیے ریاست کے دو معنوں (محدود اور وسیع) کو سمجھنا اور ان میں تصوراتی نگاہ سے تفریق کرنا بے حد اہم ہے۔ جو لوگ ریاست کو محض ایک جدید اختراع سمجھتے ہیں، وہ اس معاملے میں منطقی مغالطوں (logical fallacies) کا شکار ہوتے ہیں۔ ان کے دلائل کا آغاز جس تصورِ ریاست سے ہوتا ہے، وہ اکثر اس سے مختلف ہوتا ہے جسے وہ اپنے دلائل کے نتائج میں استعمال کر رہے ہوتے ہیں۔

ریاست: محدود اور وسیع تصور

جب ہم عام طور پر ریاست کی بات کرتے ہیں تو ہمارا ذہن فوراً اس کے محدود تصور کی طرف جاتا ہے۔ یہ محدود تصور بنیادی طور پر انتظامیہ (حکومت، بیوروکریسی، پولیس، فوج)، مقننہ (پارلیمنٹ)، اور عدلیہ جیسے اداروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ وہ ظاہری ڈھانچہ ہے جسے لوگ عموماً ریاست سمجھ لیتے ہیں۔

تاہم، ریاست کا یہ محدود تصور دراصل اس کے ایک وسیع تر تصور کے اندر جڑا ہوا ہے۔ اس وسیع تصور کے بغیر محدود تصور کی طویل مدتی فعالیت (long-term function) ممکن

نہیں ہوتی۔

وسیع تصور میں شامل عناصر

ریاست کے وسیع تصور میں وہ تمام افراد اور ادارے شامل ہوتے ہیں جو ریاستی تعقل (rationality) کو پیدا کرتے ہیں، اس کی پرورش کرتے ہیں اور اسے مسلسل دوبارہ پیدا (reproduce) کرتے رہتے ہیں۔ آج کی ریاست میں اس وسیع تصور میں تعلیمی ادارے اور نظام، میڈیا، معاشی ادارے (خاص طور پر فنانشل ادارے)، اور معاشرے کے اندر موجود قوی انٹرسٹ گروپس شامل ہیں۔ یہ سب مل کر ریاست کے ایک جامع اور وسیع تصور کو جنم دیتے ہیں۔

ریاست کے وسیع تصور میں کیا کچھ شامل ہو گا یہ ایک حادثاتی (contingent) چیز ہے۔ عموماً یہ ریاست کی ماہیت، اس کی نظریاتی بنیادوں، نظام اور تاریخی سیاق پر منحصر ہوتا ہے۔

ریاست کے جدید اختراع ہونے کے قائلین اور تاریخی فہم

جو لوگ ریاست کو محض ایک جدید اختراع سمجھتے ہیں، وہ یا تو ریاست کے اس وسیع تصور کو سمجھتے نہیں ہیں یا پھر اسے جان بوجھ کر نظر انداز کرتے ہیں۔ ان دونوں تصورات کو سامنے رکھا جائے تو وہ بہت سی مثالیں جو ریاست کے جدید اختراع ہونے اور ماقبل جدید زمانے میں ریاست کے وجود نہ ہونے پر دی جاتی ہیں، لغو ہو جاتی ہیں۔

اس کی بہترین مثال قرونِ وسطیٰ میں چرچ کی دی جاسکتی ہے۔ چرچ کو اس طرح دیکھنا کہ وہ قائم ریاستوں کی کلیت کو منسوخ کرتا ہے، مسئلے کو صحیح طریقے سے دیکھنے کا طریقہ نہیں ہے۔ بلکہ اسے صحیح طریقے سے یوں دیکھنا چاہیے کہ چرچ خود ریاست کے وسیع تصور کا حصہ تھا۔ چرچ اور اس کے اداروں کے بغیر قرونِ وسطیٰ کی ریاستوں کو ان کے محدود معنوں میں متصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس لیے چرچ کی قوت اور اس کے وجود کو قرونِ وسطیٰ میں ریاست کے عدم وجود کو ثابت کرنے کے لیے مثال نہیں مانا جاسکتا۔ درحقیقت، یہ مثال قرونِ وسطیٰ

کی ریاست کی وسیع جہت میں پیوستگی (embeddedness) کی طرف اشارہ کرتی ہے، جس کا ایک اہم حصہ چرچ بھی تھا۔

قرونِ وسطیٰ کی ریاست اور جاگیر دارانہ نظام

قرونِ وسطیٰ میں، بظاہر ایسا لگتا تھا کہ بادشاہ کا اختیار محدود ہے کیونکہ جاگیر داروں کے پاس اپنی فوجیں، اپنے عدالتی نظام اور اپنے مخصوص علاقے میں خود مختاری تھی۔ یہ اس تصور کو جنم دے سکتا ہے کہ ایک "ریاست" موجود نہیں تھی یا بادشاہ جو ریاست کا چہرہ تھا اس کی کلیت مکمل نہیں تھی۔

لیکن اگر ہم اسے ریاست کے وسیع تصور کی روشنی میں دیکھیں، تو یہ جاگیر دار اور ان کی فوجیں دراصل اس دور کی ریاست کے اندرونی ڈھانچے اور تعقل کا حصہ تھیں۔ بادشاہ اگرچہ براہ راست ہر جگہ کنٹرول نہیں کر پاتا تھا، لیکن جاگیر داروں کی یہ طاقت (اور ان کی قوت اور وسائل عنف پر جزوی اجارہ داری) کسی نہ کسی شکل میں بادشاہ کی کلیت کے تابع تھا۔ جاگیر دار بادشاہ کے وفادار ہوتے تھے (کم از کم نظریاتی طور پر)، اسے فوجی امداد فراہم کرتے تھے، اور ان کا وجود بادشاہ کے تسلیم کرنے سے مشروط ہوتا تھا۔ یہ ایک طرح کی طاقت کی تقسیم (decentralization of power) تھی جو اس دور کی ریاست کی مخصوص ماہیت اور تاریخی سیاق کے مطابق تھی۔

اس نظام میں، جاگیر دار صرف آزاد حکمران نہیں تھے بلکہ وہ ریاست (بادشاہ) کے وسیع تصور کا حصہ تھے جو ریاست کی طاقت کو نچلی سطح پر نافذ کرنے کا کام کر رہے تھے۔ ان کی فوجیں، اگرچہ آج بعض لوگ انہیں "پرائیویٹ" فوجیں کہتے ہیں، حقیقت میں مجموعی ریاستی دفاعی ڈھانچے میں شامل تھیں۔ ان کے عدالتی نظام بھی بڑی حد تک ریاست (چرچ، روایات، بادشاہ) کے قائم کردہ قانونی فریم ورک کے اندر ہی کام کرتے تھے۔

لہٰذا، قرونِ وسطیٰ میں ریاست اور جاگیر داروں کے درمیان اختیارات کی یہ تقسیم ریاست کی عدم موجودگی یا لازماً کمزوری کی علامت نہیں تھی، بلکہ یہ اس دور کی ریاست کی بنیادی ساخت

اور اس کے وسیع تصور کی عکاسی کرتی تھی۔ یہ ایک ایسا نظام تھا جہاں قوت، حاکمیت مطلقہ اور عنف و قوت پر اجارہ داری ایک مخصوص شکل میں، یعنی محدود اور وسیع دونوں سطحوں پر، کارفرما تھی جو اس دور کی ریاست کی ماہیت کے لیے لازمی تھی۔

بیوروکریسی اور ٹیکنوکریسی: جدید ریاست کے ساتھ خاص ہونے کا دعویٰ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بیوروکریسی (Bureaucracy) اور ٹیکنوکریسی (Technocracy) سرمایہ دارانہ ریاستوں کے نظام کے ساتھ خاص ہے اس کی تفصیل اس رسالے کے دوسرے مضامین میں موجود ہے۔ یہ انتظامی اشرافیہ سرمایہ داری کی عمومی ریشنلٹی (rationality) اور عمومی مفادات کی محافظ ہوتی ہیں۔ ان کو سرمایہ دارانہ "علوم" میں مہارت اور سرمایہ دارانہ تعقل (rationality) کو اپنے اندر مجسم کرنے کی بنا پر امتحانات اور تعلیم (بشمول سوشلایزیشن) کے طویل سلسلوں کے بعد منتخب کیا جاتا ہے۔

انتظامی اشرافیہ کا تاریخی وجود اور ریاست کے تصور کی توسیع

تاہم یہ کہنا درست نہیں ہے کہ انتظامی اشرافیہ (administrative elite) کا وجود صرف جدید ریاست کے ساتھ خاص ہے۔ قرونِ وسطیٰ کی عیسائی ریاستوں اور اسلامی ریاستوں میں بھی ایک انتظامی اشرافیہ موجود تھی، جو اپنے متعلقہ علوم (عیسائی یا اسلامی علوم) کی بنیاد پر منتخب کی جاتی تھی۔ ان کا بنیادی مقصد بھی اپنے وسیع نظام حیات کی حفاظت اور اسے تطبیق (application) دینا ہوتا تھا۔

مثلاً اگر ہم انگریزی لفظ "کلرک" (Clerk) ہی کو دیکھیں جس کا اشتقاق "عیسائی عالم" کے معنی سے ہے، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قرونِ وسطیٰ کی عیسائی ریاستوں میں انتظامیہ دراصل عیسائی علماء پر مشتمل ہوتی تھی یا ان کی صفوں سے نکلی ہوئی ہوتی تھی۔ ان ریاستوں میں عیسائی نظام تعلیم کے علاوہ کسی اور نظام تعلیم کا تصور ہی نہیں تھا۔ اسی طرح، اسلامی ریاستوں میں بھی اسلامی نظامِ تعلیم کے علاوہ کسی اور نظام تعلیم کا تصور یا ضرورت نہیں تھی۔ حتیٰ کہ ٹیوڈر دور (Tudor period) میں جو جدیدیت کے ابتدائی ادوار میں سے ہے، وہاں

بھی مثلاً ہنری ہشتم کے وزرائے اعظم دراصل عیسائیت کے بڑے بڑے علماء اور کارڈنل تھے۔ اسلامی تناظر میں یہ بات مثلاً مغل سلطنت کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔

یہ تمام مثالیں اس بات کی تصدیق کرتی ہیں کہ اگرچہ جدید بیوروکریسی اور ٹیکنوکریسی کی شکل اور بنیاد سرمایہ دارانہ ریشنلٹی پر قائم ہے، لیکن انتظامی اشرافیہ کا تصور اور اس کا ریاست کے تعقل کی بنیاد پر انتخاب کوئی جدید مظہر نہیں۔ ہر دور میں ریاست کی اپنی مخصوص ماہیت اور نظریاتی بنیادوں کے مطابق ایک انتظامی اشرافیہ موجود رہی ہے جو ریاستی تعقل اور اس کے وسیع تر مقاصد کی حفاظت اور نفاذ کرتی تھی۔

یہ دلائل اس دعوے کی نفی کرتے ہیں کہ ریاست، خواہ اسے محدود یا وسیع تناظر میں دیکھا جائے، جدید بیوروکریسی کے بغیر موجود نہیں ہو سکتی تھی۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ریاست کی انتظامیہ کا وجود اس کی ماہیت کا لازمی حصہ ہے، چاہے اس کی شکل اور بنیاد وقت کے ساتھ بدلتی ہی کیوں نہ رہی ہو۔

میکس ویبر نے بیوروکریسی کے ساتھ غیر شخصی قواعد، اداروں اور عقلی قانون کے تصور کو جوڑا ہے، جس کے مطابق جدید ریاست میں قانون، قواعد اور ادارے حکمران یا اس کے کارندوں کے ذاتی تعلقات سے ہٹ کر ایک غیر شخصی میزان پر قائم ہوتے ہیں۔ یہ میزان حاکم اور محکوم دونوں پر یکساں لاگو ہوتی ہے، جس کی بنا پر جدید ریاست کو ماقبل جدید ریاست سے مختلف تصور کیا جاتا ہے۔ یہ دعویٰ ہے کہ جدید ریاست ایک نیا وجود ہے۔ ویبر کا غیر شخصی عقل و قانون کا تصور سرمایہ داری کے ارتقاء سے گہرا تعلق رکھتا ہے، کیونکہ سرمایہ خود ایک غیر شخصی حقیقت ہے جو خالص مقداریت (pure quantification) کو فروغ دیتا ہے۔ سرمایہ کا یہ غیر شخصی پن ایک خاص قسم کی تجریدیت اور تعقل کو جنم دیتا ہے۔

تاہم، اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ دوسری تہذیبوں اور ریاستوں میں غیر شخصی حکم اور قوانین کا تصور موجود نہیں تھا۔ تعقل بذات خود ایک غیر شخصی تصور ہے، اور اگر ہر ریاست جوازیت (legitimacy) کے اصول پر قائم ہوتی ہے اور اگر جوازیت کا وجود تعقل کو لازم

ہے تو پھر ہر ریاست میں کسی نہ کسی صورت میں "غیر شخصی قانون و قواعد" کا وجود لازم ہے۔ البتہ، ہر ریاست کا یہ غیر شخصی پن اور بے نامی اس کی بنیادی اقدار اور تعقل سے رنگ پاتی ہے۔ مثال کے طور پر، قرون وسطیٰ کی ریاستوں کی بنیاد عیسائی علمیت پر قائم ایک خاص قسم کے تعقل پر تھی جس میں غیر شخصی قواعد کا اطلاق ہوتا تھا۔ اسی طرح، اسلامی ریاستوں میں جو غیر شخصی پن فروغ پاتا ہے وہ اسلامی علوم اور قوانین کی حکمرانی پر منتج ہوتا ہے، جو حاکم اور محکوم دونوں پر یکساں لاگو ہوتے ہیں۔ یوں، غیر شخصی قواعد و ضوابط کا تصور ہر دور اور ہر تہذیب میں مختلف صورتوں میں موجود رہا ہے۔

قومی ریاست اور جدید ریاست: یہ ایک عام خیال ہے کہ چونکہ جدید ریاست ایک قومی ریاست ہے اور قومی ریاست کا وجود جدید ریاست سے پہلے نہیں ملتا، اس لیے یہ ایک بالکل نئی اختراع ہے۔ تاہم، یہ دلیل بظاہر قوی لگنے کے باوجود مضبوط بنیادوں پر استوار نہیں۔ ہمارے ہاں جدید دور میں لبرل، مارکسسٹ، فاشسٹ اور اسلامی ریاستیں بھی موجود رہی ہیں۔ ان متنوع اشکال کے باوجود کسی نے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا کہ ایک لبرل، مارکسسٹ یا غیر اسلامی ریاست، ریاست ہی نہیں کہلائے گی، تو پھر یہ نتیجہ کیسے نکالا جا سکتا ہے کہ قومی ریاست ہی ریاست کا واحد عملی وجود ہے؟

یہ تسلیم کرنا درست ہے کہ دورِ جدید میں غیر قومی ریاستوں کی عملی مثالیں خال خال ہی ملتی ہیں، حتیٰ کہ اسلامی ریاستیں بھی اکثر "قومی" ریاستیں ہی رہی ہیں، جیسے کہ ایران اور افغانستان۔ لیکن اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ غیر قومی ریاست کا تصور ایک متضاد یا ناممکن تصور ہے۔ اگر ہم ایک ایسی ریاست کا تصور کریں جو قومی نہیں بلکہ آفاقی یا عالمگیر نوعیت کی ہو، تو یہ تصور کم از کم نظریاتی طور پر اپنی ماہیت میں کسی تضاد کا شکار نہیں۔

جہاں تک کسی ریاست کی عملی تجسیم کا تعلق ہے، تو جو چیز ماضی میں موجود نہیں تھی اور اب ہے (جیسے قومی ریاست)، اس کے بارے میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے۔ عملی مثال نہ ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ ہم مستقبل میں ایک جدید غیر قومی ریاست

قائم نہیں کر سکتے۔ بلا شبہ قبل از جدید دور میں غیر قومی ریاستیں قائم رہی ہیں، لہٰذا تصوراتی اور امکانی لحاظ سے اس میں کوئی تضاد نظر نہیں آتا کہ ایسی ریاستیں مستقبل میں بھی موجود ہو سکتی ہیں۔

سرمایہ داری کا ایک بہت بڑا تضاد یہ ہے کہ سرمایہ خود عالمگیر ہے، لیکن جس نظام نے اسے فروغ دیا ہے وہ قومی ریاست ہے۔ امریکہ، جو سرمائے کا سب سے بڑا محافظ ہے اور عالمی رسائی رکھتا ہے، اس کی بھی عملی کمزوری یہ ہے کہ اس کا جواز قومی ہے۔ عالمی پہنچ اور عالمگیر ایجنڈے کے باوجود اس کی ریاست قومی ہے، اسی لیے اس کی عملی پالیسیاں اکثر تضاد کا شکار رہتی ہیں۔

اس لیے ہمیں یہ تسلیم کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہونی چاہیے کہ جدید قومی ریاست کے علاوہ جدید ریاست کا کوئی عملی ظہور نہیں ہوا، لیکن تصوراتی لحاظ سے بھی اور عملی لحاظ سے بھی یہ ناممکن نہیں ہے۔ جیسا کہ قبل از جدید دور میں غیر قومی ریاستیں قائم رہی ہیں، تو تصوراتی اور ممکناتی لحاظ سے اس میں کوئی تضاد نظر نہیں آتا کہ وہ مستقبل میں بھی وجود میں آسکیں۔

ریاست کی دائمی حقیقت؛ سرحدوں اور پاسپورٹ کا ارتقائی تصور: ریاست کی دائمی حقیقت پر بحث کرتے ہوئے، ایک اہم سوال یہ اٹھایا جاتا ہے کہ کیا ریاست کا تصور محض سرحدوں کے تعین اور پاسپورٹ کے اجراء کے ساتھ ہی وجود میں آیا؟ اس سوال کا جواب نفی میں ہے، کیونکہ کسی بھی شے کی کچھ لازمی اور کچھ عارضی صفات ہوتی ہیں۔ عارضی صفات کے نہ ہونے سے اس شے کا وجود ختم نہیں ہو جاتا۔ مثال کے طور پر، ایک کرسی کا مخصوص رنگ اس کی عارضی صفت ہے؛ رنگ بدلنے سے کرسی اپنی کرسی ہونے کی بنیادی حیثیت نہیں کھوتی۔ لیکن اگر اس کی بیٹھنے کے قابل ہونے کی لازمی صفت ختم ہو جائے تو وہ کرسی نہیں رہتی۔ اسی طرح، ریاست کے کچھ عارضی مظاہر ہوتے ہیں، جن میں سرحدوں کی واضح نشاندہی اور پاسپورٹ کا اجراء شامل ہو سکتے ہیں۔ ان عارضی صفات کے موجود نہ ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ ریاست کا تصور ہی موجود نہیں تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ سرحدوں کا تصور کوئی نیا مظہر نہیں ہے۔ قدیم زمانے سے ہی مختلف شکلوں میں علاقائی حدود کا شعور موجود رہا ہے۔ قدیم سلطنتوں اور شہری ریاستوں کی اپنی متعین حدود تھیں، جن کی حفاظت کی جاتی تھی اور جن کی خلاف ورزی کو جارحیت سمجھا جاتا تھا۔ رومن سلطنت اور یونانی شہری ریاستیں اس کی واضح مثالیں ہیں۔ قبائلی معاشروں میں بھی، اگرچہ باضابطہ نقشہ سازی نہیں تھی، لیکن مختلف قبائل کے اپنے تسلیم شدہ علاقے ہوتے تھے، جن کا احترام کیا جاتا تھا۔ جلاوطنی کا قدیم قانون بھی سرحد کے تصور کی ایک واضح مثال ہے، جس میں کسی فرد کو اس کی برادری یا ریاست کی متعین حدود سے باہر نکال دیا جاتا تھا۔

اسی طرح، پاسپورٹ کا موجودہ رسمی تصور اگرچہ ایک نسبتاً جدید ایجاد ہے، لیکن اس کی بنیادی روح اور ضرورت قدیم زمانے سے ہی موجود رہی ہے۔ قدیم معاشروں میں، جب لوگ ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں سفر کرتے تھے، تو انہیں اپنی شناخت اور حیثیت ثابت کرنے کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس مقصد کے لیے مختلف طریقے استعمال کیے جاتے تھے۔ شاہی یا سرداری خطوط ایک عام طریقہ تھا، جن میں ایک حکمران اپنے سفیر یا کسی معتبر شخص کے لیے دوسرے حکمران کے نام ایک سفارش نامہ بھیجتا تھا۔ یہ خط ایک طرح کے سفری اجازت نامے یا ابتدائی پاسپورٹ کا کام کرتا تھا۔

بعض اوقات، امان یا تحفظ کا وعدہ بھی ایک عارضی پاسپورٹ کی حیثیت رکھتا تھا۔ کسی بااثر شخص کی طرف سے دیا گیا یہ وعدہ کسی بیرونی فرد کو ایک خاص علاقے میں محفوظ رہنے کی اجازت دیتا تھا۔ مذہبی یا ثقافتی علامات بھی شناخت اور محفوظ گزرگاہ کے حصول کا ذریعہ بنتی تھیں۔ یہاں تک کہ آسٹریلیا کے قدیم باشندوں کے ہاں بھی درختوں کی شاخوں پر مشتمل ایک طرح کا "پاسپورٹ" موجود تھا، جو ایک قبیلے کے علاقے سے دوسرے قبیلے کے علاقے میں سفر کرنے کی اجازت دیتا تھا۔ یہ علامات مسافر کی شناخت اور متعلقہ قبیلے کی اجازت کی نشان دہی کرتی تھیں۔

ان مثالوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سرحدوں اور پاسپورٹ کا تصور، اگرچہ وقت کے ساتھ

ساتھ ارتقاء پذیر ہوا ہے اور اس کی شکلیں بدلی ہیں، لیکن ان کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ ریاست کی بنیادی حقیقت محض ان رسمی دستاویزات اور متعین حدود پر منحصر نہیں ہے، بلکہ یہ ایک وسیع تر تصور ہے جس میں اقتدار، علاقہ اور لوگوں کا ایک منظم گروہ شامل ہیں۔ سرحدیں اور پاسپورٹ اس ریاست کے انتظامی اور عملی پہلوؤں کو سہولت فراہم کرتے ہیں، لیکن یہ خود ریاست کے وجود کی لازمی شرائط نہیں ہیں۔ ریاست کا جوہر ان عارضی مظاہر سے کہیں زیادہ دائمی اور وسیع ہے۔

مضمون کے آخر میں ہم اس بات کا جائزہ لیں گے کہ ریاست کے ماقبل جدید دور میں موجود ہونے کے انکار کے پیچھے کیا اسٹریٹیجک مقاصد کارفرما ہوسکتے ہیں:

ماقبل جدید دور میں ریاست کے وجود کے انکار کے اسٹریٹجک اہداف:

جب یہ کہا جاتا ہے کہ ماضی میں کوئی "ریاست" نہیں تھی، تو اس کے کئی اہم مقاصد ہوتے ہیں:

- جدید قومی ریاست کو واحد "حقیقی" ریاست ثابت کرنا: یہ دعویٰ موجودہ قومی ریاست کو ریاست کی واحد، فطری اور حتمی شکل کے طور پر پیش کرتا ہے، اس کی عالمی بالادستی کو مضبوط کرتا ہے اور اس کے متبادل تصورات کو غیر حقیقی قرار دیتا ہے۔
- تاریخی تسلسل کو توڑنا اور ایک "نئی ابتدا" کا دعویٰ: اس سے یہ باور کرایا جاتا ہے کہ "جدید" دور ایک مکمل نئی شروعات ہے، جو جدیدیت اور اسکی بنیاد پر قائم نظام کو جواز فراہم کرتا ہے۔
- عالمی اداروں اور قوانین کی بنیاد مضبوط کرنا: اگر ریاست کو صرف ایک جدید قومی ریاست کے طور پر دیکھا جائے، تو یہ بین الاقوامی قوانین اور اقوام متحدہ جیسے عالمی اداروں کی بنیاد کو مضبوط کرتا ہے جو قومی ریاستوں کے تعلقات کو منظم کرتے ہیں۔

- طاقت کے ڈھانچے کو برقرار رکھنا اور چیلنج سے بچنا: یہ دعویٰ موجودہ سیاسی، اقتصادی اور سماجی ڈھانچے کو چیلنج کرنے والے افکار کو دباتا ہے، اور یہ تاثر دیتا ہے کہ موجودہ نظام ناگزیر ہے۔ اس کو عالمی سرمایہ داری کے تناظر میں بھی دیکھا جا سکتا ہے، جہاں قومی ریاست عالمگیر سرمائے کی نقل و حرکت کے لیے منظم ڈھانچہ فراہم کرتی ہے۔
- مغرب کے سیاسی ارتقاء کو عالمگیر نمونہ قرار دینا: یہ دلیل اکثر اس مغربی نقطۂ نظر سے آتی ہے کہ 'جدید ریاست' کا تصور مغربی ارتقاء کا نتیجہ ہے۔

جدید دور میں اسلامی ریاست کے تصور کو ناقابل عمل ثابت کرنے کے اسٹریٹجک اہداف:

- اسلامی اہداف سے عدم مطابقت کا دعویٰ: یہ دلیل دی جاتی ہے کہ جدید ریاستی ڈھانچہ (قومی ریاست، اس کے سیکولر قوانین، معاشی نظام، وغیرہ) اسلامی اقدار اور اہداف سے بنیادی طور پر متصادم ہے، جس سے اسلامی مقاصد کے حصول کے لیے 'اسلامی ریاست' کا قیام بذات خود ایک تضاد قرار پاتا ہے۔ یہ احیائے اسلام کی تحریکوں کو نظریاتی طور پر کمزور کرتا ہے اور مسلمانوں میں مایوسی پھیلانے کا باعث بن سکتا ہے۔ یہ دلیل اس منطقی اغلوطے پر قائم ہے کہ قوت کا ارتکاز لازماً سیکولر اور سرمایہ دارانہ ہو گا۔
- استعمار اور سرمایہ داری سے مقابلے کی راہ مسدود کرنا: اگر اسلامی ریاست کا قیام ناممکن قرار دے دیا جائے تو پھر استعمار اور عالمگیر سرمایہ داری سے منظم ریاستی سطح پر مزاحمت کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ ریاست کے بغیر، کسی بھی بڑی تبدیلی کو لانا یا سامراجی قوتوں کا مقابلہ کرنا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔ (اس کی تفصیل اس شمارے کے دوسرے مضامین میں ملاحظہ فرمائیں)۔
- نو آبادیاتی باج گزار ریاستوں کا تحفظ: یہ استدلال موجودہ مسلم اکثریتی ممالک میں قائم ان ریاستوں کو استحکام بخشتا ہے جن کا ڈھانچہ اور پالیسیاں مغربی طرز پر مبنی

ہیں۔ جب اسلامی انقلاب کے ذریعے ان ریاستوں کو چیلنج کرنے کے تصور کو ناممکن قرار دے دیا جاتا ہے، تو ان ریاستوں کو اندرونی اور بیرونی خطرات سے تحفظ مل جاتا ہے اور وہ موجودہ عالمی نظام کا حصہ بنی رہتی ہیں۔

حاصل بحث

مضبوط ریاست کا وجود اسلام کے تحفظ، اسلامی معاشرے اور اسلامی اقدار و تہذیب کے تحفظ اور غلبے کے لیے ناگزیر ہے، کیونکہ قوت کا مقابلہ قوت ہی سے کیا جاسکتا ہے اور ترکیز قوت کا مقابلہ ترکیز قوت ہی سے کیا جاسکتا ہے:

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۚ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ (سورۃ الانفال، آیت ۶۰)

اور تم لوگ، جہاں تک تمہارا بس چلے، زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے اُن کے مقابلہ کے لیے مہیّا رکھو تاکہ اس کے ذریعہ سے اللہ کے اپنے دشمنوں کو اور ان دوسرے اعداء کو خوف زدہ کر دو جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے۔ اللہ کی راہ میں جو کچھ تم خرچ کرو گے اس کا پورا پورا بدل تمہاری طرف پلٹایا جائے گا اور تمہارے ساتھ ہرگز ظلم نہ ہوگا۔

اسلامی ریاست کا قیام اور اس کا وجود اس آیت شریفہ کے عمومی حکم میں داخل ہے۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے مدینہ منورہ میں اپنی مبارک ریاست قائم فرمائی اور اس وقت سے لے کر عثمانیہ سلطنت کے زوال تک یہ ریاست کسی نہ کسی شکل میں تسلسل کے ساتھ قائم رہی اور اس کے ذریعے اس آیت شریفہ میں بیان کیے گئے فرائض کی تکمیل ہوتی

رہی۔

استعمار نے اسلامی ملکوں میں اس ریاست کو ختم کیا اور آج استعمار اور اس کے ایجنٹ ہی اس ریاست کے قیام کی کوششوں کے خلاف نظریاتی اور عملی بند باندھے ہوئے ہیں۔

آج اللہ کا شکر ہے کہ کم از کم تین اسلامی ریاستیں افغانستان ایران اور یمن میں قائم ہیں اور انشاءاللہ ان تین ریاستوں نے جو سنت قائم کی ہے وہ پوری دنیا میں پھیلے گی اور ہر جگہ اس سنت شریفہ کی نقل کی جائے گی۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے اپنے ملکوں میں اسلامی ریاست کے قیام کے لیے حد استطاعت کوشش کریں۔ انشاءاللہ ہم یہ کوشش کرتے رہیں گے۔

اسلامی ریاست کا قیام نصوص شرعیہ اور امت کے اجماع سے ثابت ہے اور خوارج کے غالی فرقوں کے علاوہ کسی نے اس کا انکار نہیں کیا۔ نہ سنیوں نے نہ شیعوں نے نہ کسی اور اسلامی مذہب نے۔ آج جو لوگ اسلامی ریاست کے مخالف ہیں یا تو استعمار کے ایجنٹ ہیں کیونکہ استعمار اپنی قوت کے مقابلے میں کسی اور قوت کے ارتکاز کو اپنے لیے خطرہ سمجھتا ہے یا ایسے کم فراست اور کم فہم مسلمان ہیں جن کو ہماری ادبیات میں مغفلین کہا گیا ہے۔

ہمیں استعمار کے شعوری اور غیر شعوری ایجنٹوں سے ہر سطح پر جنگ جاری رکھنی چاہیے اور انشاءاللہ ہم اس اس مقدس جنگ کو جاری رکھیں گے۔

حوالہ جات

اس شمارے میں شامل دیگر مضامین اس تحریر کا سیاق اور اس میں شامل مضامین کی تفصیل بیان کرتے ہیں:

انصاری، جاوید، ۲۰۲۰، دروس سرمایہ داری، الغزالی پبلشرز کراچی۔

انصاری، جاوید، ۲۰۲۳، جمہوریت کی حقیقت، الغزالی پبلشرز کراچی۔

Ansari, Javed, 2016, *Rejecting Freedom and Progress: The Islamic Case Against Capitalism*, Sheikh Zayed Centre, University of Punjab.

Ansari, Javed, 2017, *Capitalist Values and Ideologies: An*

Islamic Approach, University of Karachi Press.
Creveld, Van, 1999, *The Rise and Decline of the State*, Cambridge University Press.
Chandra, Kukathas, 2014, A definition of the state, *University of Queensland Law Journal*, 33(2): 357-366.
Collins, James B., 1995, *The State in Early Modern France*, Cambridge University Press.
Jessop, Bob, 1982, *The Capitalist State: Marxist Theories and Methods*, Martin Robertson.
Roberts, J. M., 2007, *The New Penguin History Of The World*, 5th edition revised & updated by Arne Westad, Penguin.
Scott, David, 2014, *Leviathan: The rise of Britain as a world power*, William Collins.
Smith, Vincent, 1958, *The Oxford History of India*, Oxford University Press.

ریاست درون ریاست کی تعمیر: ایک اسلامی انقلابی تجزیہ

امین اشعر

ریاست درون ریاست کا تصور انقلابی بیانیے کے لیے ایک کلیدی سیاسی مظہر ہے جو کسی بھی ریاست کی خود مختاری اور حاکمیت کے لیے سنگین چیلنج بن سکتا ہے۔ یہ محض ایک نظریاتی بحث ہی نہیں بلکہ انقلابی عمل کا ایک بنیادی زینہ ہے۔ اس عمل میں ریاستی ڈھانچے کے متوازی ایک ایسا طاقتور ادارتی ڈھانچہ پروان چڑھایا جاتا ہے جو اپنے الگ اصولوں اور ضابطوں پر مشتمل ہوتا ہے، اور اسی بنیاد پر انقلابی تحریک منظم طریقے سے اپنی قوت کو مستحکم کرتی چلی جاتی ہے۔

"اندرون ریاست" کے اس مظہر کو دو مختلف معنوں میں سمجھنا ضروری ہے:

پہلا مفہوم ان کوششوں سے متعلق ہے جہاں تبدیلی موجودہ ریاستی اداروں کے اندر رہتے ہوئے لانے کی سعی کی جاتی ہے۔ اس صورت میں، مقصود یہ ہوتا ہے کہ ریاست کی موجودہ مشینری کو مکمل طور پر ختم کرنے کے بجائے، اس کے اندر ضم ہو کر یا اس کے حصوں پر کنٹرول حاصل کر کے، اپنے نظریات کے مطابق ڈھال لیا جائے۔

اس کے برعکس، دوسرا اور انقلابی مفہوم، معاشرے میں ریاست کے متوازی ادارے بنانے کی کوشش کرنا اور انہیں مضبوط کرنا ہے۔ یہ متوازی ڈھانچے ریاستی کنٹرول سے باہر ہوتے ہیں اور ان کا مقصد آہستہ آہستہ موجودہ ریاست کے اداروں پر حاوی ہونا ہوتا ہے۔ انقلابی نقطۂ نظر سے، اسے محض ایک غیر ریاستی گروہ کا وجود نہیں، بلکہ ایک ایسی شعوری اور منظم کوشش کے طور پر دیکھا جاتا ہے جس کا مقصد موجودہ نظام کو اندر سے چیلنج کرنا، پرانی ریاست کو تتر بتر کرنا اور بالآخر ایک متبادل نظام قائم کرنا ہوتا ہے۔

تاریخی اور معاصر مثالیں: "ریاست درون ریاست" کا ارتقائی سفر

"ریاست درون ریاست" کا مظہر تاریخ کے مختلف ادوار میں سامنے آیا ہے، جو کبھی مرکزی

ریاست کو مکمل طور پر بدل دیتا ہے تو کبھی اس کے اندر ایک مستقل چیلنج کے طور پر موجود رہتا ہے۔ ذیل میں چند اہم مثالیں پیش ہیں جو انقلابی حکمت عملی کی تعمیر میں مددگار ہوں گی۔

سوویت انقلاب (۱۹۱۷): بالشویکوں کی متوازی حکمرانی

زار کی کمزور حکمرانی اور پہلی عالمی جنگ کے دوران پھیلی بدامنی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، بالشویکوں نے مزدوروں اور سپاہیوں کی سوویتیں کے اندر، جو پہلے سے موجود معاشرتی ادارے تھے، نفوذ کیا اور بالآخر ان پر غلبہ حاصل کر لیا۔ اس طرح انہوں نے ان سوویتوں کو اپنی انقلابی حکمت عملی کے لیے استعمال کیا، جس کا حتمی مقصد موجودہ حکومت کا تختہ الٹ کر پرولتاریہ کی آمریت قائم کرنا تھا۔ اکتوبر انقلاب کے دوران، یہ متوازی ڈھانچے اتنے مضبوط ہو چکے تھے کہ انہوں نے باآسانی پرانی ریاست کی جگہ لے لی اور سوویت یونین کی بنیاد رکھی۔ یہ اس بات کی واضح مثال ہے کہ کیسے ایک "ریاست درون ریاست" مکمل ریاستی تبدیلی کا باعث بن سکتی ہے۔

ایران کا اسلامی انقلاب (۱۹۷۹): مذہبی ڈھانچوں کا عروج

ایران کا اسلامی انقلاب "ریاست درون ریاست" کے ذریعے مکمل ریاستی تبدیلی کی ایک اور بہترین مثال ہے۔ ۱۹۷۰ کی دہائی کے اواخر میں، جب شاہ ایران کی حکومت اپنی جڑیں کھو رہی تھی، آیت اللہ العظمی امام روح اللہ خمینی رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں مذہبی رہنماؤں نے انقلاب سے قبل، مساجد، مدارس اور حسینیات کے نیٹ ورک قائم کیے۔ اس کے ساتھ ساتھ مختلف انقلابی کمیٹیاں اور نیم فوجی گروہ متوازی ڈھانچوں کے طور پر سرگرم تھے، جنہوں نے شاہی نظام کے خلاف عوامی مزاحمت کو منظم کیا۔ انقلاب کی کامیابی کے فوری بعد، انہی انقلابی جذبات اور رضاکاروں کو ایک منظم شکل دینے کے لیے پاسداران انقلاب جیسی فورسز کا باضابطہ قیام عمل میں آیا، جنہوں نے تیزی سے انتظامی، عدالتی اور عسکری طاقت حاصل کر لی۔

جب شاہی حکومت بالآخر گر گئی، تو یہ متوازی ڈھانچے بغیر کسی بڑی رکاوٹ کے مرکزی

ریاست کے اداروں پر قابض ہو گئے اور پرانے اداروں کو تتر بتر کر کے ان نئے اداروں کی بنیاد پر اسلامی جمہوریہ ایران کی بنیاد رکھی۔ یہ انقلاب بھی سوویت ماڈل کی طرح متوازی طاقت کے عروج اور ریاستی تبدیلی کی ایک روشن مثال ہے۔

حزب اللہ اور لبنان ایک مستقل ریاست درون ریاست

لبنان میں حزب اللہ "ریاست درون ریاست" کی ایک معاصر مثال کے طور پر موجود ہے۔ اس تنظیم نے، جو بیک وقت ایک سیاسی جماعت اور ایک طاقتور ملیشیا ہے، لبنانی ریاست کے اندر ایک مضبوط اور خود مختار ڈھانچہ قائم کر رکھا ہے۔ ان کے پاس ایک طاقتور عسکری ونگ ہے جو لبنانی فوج سے بھی زیادہ منظم اور لیس ہے؛ وہ اپنے سماجی ادارے (اسپتال، اسکول، فلاحی منصوبے) چلاتے ہیں اور ان کا اپنا مالیاتی نظام اور متوازی مالیاتی ادارے بھی ہیں۔ حزب اللہ کی یہ متوازی طاقت اسے ریاستی فیصلوں پر گہرا اثر ڈالنے کی صلاحیت دیتی ہے اور یہ اکثر لبنانی حکومت کی رٹ کو چیلنج کرتی ہے۔ ان کا بنیادی مقصد اسرائیل کے خلاف مزاحمت اور اسلامی نظریات کا فروغ ہے، اور وہ ایک ایسا ڈھانچہ ہیں جو مکمل طور پر ریاست کی جگہ نہیں لے رہے بلکہ اس کے اندر ایک طاقتور، نیم خود مختار اکائی کے طور پر موجود ہیں۔

طالبان عظیم الشان اور افغانستان: متوازی ڈھانچوں سے ریاستی حکمرانی تک

افغانستان کے طالبان نے "ریاست درون ریاست" کی ایک منفرد شکل پیش کی جس نے بالآخر مکمل ریاستی حکمرانی کا روپ دھار لیا۔ ۱۹۹۰ کی دہائی میں، افغانستان کی خانہ جنگی اور مرکزی حکومت کی کمزوری کے دوران، طالبان نے ملک کے بڑے حصے پر اپنی "ریاست درون ریاست" قائم کر لی۔ انہوں نے اپنی عسکری قوت کے بل بوتے پر ایک متوازی عدالتی نظام، تعلیمی پالیسیاں، اور انتظامی ڈھانچے نافذ کیے جو کابل میں موجود نام نہاد مرکزی حکومت سے بالکل مختلف تھے۔ طالبان نے اس بنیاد پر بالآخر کابل پر قبضہ کر کے امارات اسلامیہ اولی کی بنیاد رکھی۔ ۲۰۰۱ء میں امریکی حملے کے بعد اگرچہ ان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا، لیکن انہوں نے اپنی متوازی حکمرانی کو ختم نہیں کیا بلکہ دیہی علاقوں میں اپنی حکمرانی قائم رکھی اور ایک

طاقتور انقلابی جدوجہد کے طور پر کام کیا جس نے بالآخر امریکی فوج کو انخلاء پر مجبور کیا۔ اس انخلاء کے بعد، یہ متوازی ڈھانچے دوبارہ ملک پر قابض ہو گئے اور ایک بار پھر اپنی ریاست قائم کی۔ یہ مثال بھی اس بات کی شاہد ہے کہ کس طرح ایک 'ریاست درون ریاست' مکمل ریاستی تبدیلی کا پیش خیمہ بن سکتی ہے، چاہے اس میں وقفہ ہی کیوں نہ آئے۔

"ریاست درون ریاست" کیسے پروان چڑھتی ہے؟

"ریاست درون ریاست" کا پروان چڑھنا کوئی حادثاتی عمل نہیں بلکہ ایک منظم حکمت عملی اور مخصوص حالات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مندرجہ ذیل میں وہ چند بنیادی عوامل اور طریقہ کار ہیں جو انقلابی تحریکوں کو موجودہ ریاستی ڈھانچے کے متوازی ایک مؤثر قوت بنانے میں مدد دیتے ہیں۔

ریاستی کمزوریاں اور خلا

"ریاست درون ریاست" کا ابھرنا ایک ایسے عمل کا نتیجہ ہے جہاں مرکزی حکومت کی کمزوریاں، نااہلی، اور عوامی ضروریات پوری کرنے میں ناکامی اسے اپنا تعقلی جواز (legitimacy) کھونے پر مجبور کر دیتی ہے۔ یہ خلا متوازی قوتوں کو موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ خود کو عوام کے نجات دہندہ کے طور پر پیش کر کے ان کی وفاداری حاصل کر سکیں۔ سوویت انقلاب سے قبل زار شاہی روس کی کمزور حکمرانی اور ایران میں شاہی نظام کی عوامی مسائل سے دوری اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ ایران میں شاہ کو امریکا اور استعمار کا پٹھو اور شیعہ اسلامی روایات کے لیے خطرہ سمجھا گیا، جس نے امام خمینی کی قیادت میں انقلاب کو جنم دیا۔ اسی طرح، افغانستان میں سوویت شکست کے بعد مجاہدین کے ذاتی مفادات کی جنگ نے عوام کو مایوس کیا، اور طالبان اسلام و اسلامی ریاست کے مخلص علمبردار کے طور پر ابھرے۔ امارت اسلامیہ کی شکست کے بعد انہوں نے امریکی حمایت یافتہ حکومت کو بھی امریکی پٹھو حکومت قرار دے کر شکست دی، یوں کمزور ریاست کے خلا کو پُر کر کے اپنی عملداری قائم

کی۔

مضبوط نظریاتی کشش اور بیانیہ

"ریاست درون ریاست" کی کامیابی کے لیے ایک طاقتور، پرکشش، اور متبادل نظریہ انتہائی ضروری ہے۔ یہ نظریہ عوام کو ایک نیا وژن، امید، اور مقصد فراہم کرتا ہے، جو موجودہ نظام کی خامیوں کو اجاگر کرتا ہے۔ چاہے وہ کمیونزم، اسلامی نظام، یا قوم پرستی کا نظریہ ہو، یہ ایک ایسا فکری ڈھانچہ فراہم کرتا ہے جو لوگوں کو متحرک کرتا ہے اور انہیں ایک مشترکہ مقصد کے لیے متحد کرتا ہے۔ آیت اللہ العظمی امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ کا اسلامی انقلاب میں ولایت فقیہ کا نظریہ یا طالبانِ عالیشان کا شریعت مطہرہ کے نفاذ کا ہدف اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ یہ نظریہ صرف سیاسی نہیں ہوتا بلکہ سماجی، اخلاقی، اور روحانی پہلو رکھتا ہے، جو عوامی حمایت کو مزید مضبوط کرتا ہے۔

ریاستی رد عمل اور متوازی اداروں کا تحفظ

جب ایک "ریاست درون ریاست" پروان چڑھنا شروع کرتی ہے تو مرکزی ریاست کی طرف سے مختلف نوعیت کا رد عمل سامنے آتا ہے۔ یہ رد عمل اکثر متوازی ڈھانچوں کی بقا کے لیے ایک بڑا چیلنج بن جاتا ہے۔ انقلابی تحریکوں کے لیے یہ نہایت اہم ہوتا ہے کہ وہ اپنے نوزائیدہ اداروں کو اس ریاستی دستبرد سے کیسے محفوظ رکھیں۔ اس ضمن میں کئی حکمت عملیاں اختیار کی جاسکتی ہیں:

سیاسی شمولیت اور "تحفظی چھتری"

حزب اللہ کی حکمت عملی اس معاملے میں ایک نمایاں مثال ہے۔ یہ تنظیم اپنی عسکری اور سماجی قوت کو برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ لبنانی انتخابات میں حصہ لیتی ہے اور حکومت میں شامل ہوتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ اپنے متوازی ڈھانچوں (عسکری ونگ، سماجی ادارے) کو مرکزی ریاست اور بین الاقوامی دباؤ سے قانونی اور سیاسی تحفظ فراہم کرنا ہے۔

حکومت کا حصہ بن کر وہ ریاستی وسائل تک رسائی حاصل کرتی ہے، قانون سازی کے عمل پر اثر انداز ہوتی ہے، اور اپنے خلاف کسی بھی بڑی کارروائی کو سیاسی طور پر مشکل بنا دیتی ہے۔ یہ حکمت عملی انہیں ایک "تحفظی چھتری" فراہم کرتی ہے، جس کے نیچے وہ اپنے اداروں کو مزید مضبوط کر سکتے ہیں اور اپنے مقاصد کو آگے بڑھا سکتے ہیں، جبکہ براہ راست تصادم سے بچتے ہیں۔

عوامی حمایت اور سماجی جڑیں

نوزائیدہ متوازی اداروں کو تحفظ فراہم کرنے کا ایک مؤثر طریقہ وسیع عوامی حمایت حاصل کرنا ہے۔ جب ایک تحریک عوام کے دلوں میں جگہ بنا لیتی ہے اور بنیادی سطح پر ان کے مسائل حل کرتی ہے، تو ریاست کے لیے اس کے خلاف کارروائی کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لوگ اپنے رہنماؤں اور اداروں کے دفاع کے لیے کھڑے ہوتے ہیں۔ ایران کے اسلامی انقلاب میں مساجد اور حسینیات کا نیٹ ورک، اور امام خمینی کی عوامی حمایت نے شاہی حکومت کے لیے براہ راست کریک ڈاؤن کو مشکل بنا دیا۔ یہ سماجی جڑیں متوازی ڈھانچوں کو ایک قسم کی "غیر مرئی ڈھال" فراہم کرتی ہیں۔

مزاحمت کی صلاحیت اور عسکری ڈیٹرنس

بعض صورتوں میں، متوازی ادارے اپنی عسکری قوت کو اتنی حد تک مضبوط کر لیتے ہیں کہ وہ ریاست کے لیے ایک سنجیدہ خطرہ بن جائیں یا ریاست کو اس کے خلاف کارروائی کرنے سے روک دیں۔ یہ "عسکری ڈیٹرنس" کہلاتا ہے۔ اگر ریاست یہ جانتی ہے کہ کسی بھی کارروائی کا نتیجہ ایک بڑی اور مہنگی جنگ کی صورت میں نکلے گا، تو وہ محتاط ہو جاتی ہے۔ حزب اللہ کی مضبوط عسکری قوت لبنان میں اس کی بقا کی ایک بڑی وجہ ہے، کیونکہ لبنانی فوج کے لیے اسے مکمل طور پر غیر مسلح کرنا تقریباً ناممکن ہے۔

جغرافیائی پناہ گاہیں اور کنٹرول شدہ علاقے

نوزائیدہ اداروں کو مرکزی ریاست کی دستبرد سے بچانے کے لیے جغرافیائی پناہ گاہیں بھی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ یہ ایسے علاقے ہو سکتے ہیں جہاں ریاستی رٹ کمزور ہو، جیسے کہ قبائلی علاقے، پہاڑی سلسلے، یا سرحد پار کے محفوظ ٹھکانے۔ طالبان نے افغانستان کے دیہی اور پہاڑی علاقوں کو، اور TTP نے پاکستان کے قبائلی علاقوں کو اپنی پناہ گاہوں کے طور پر استعمال کیا، جہاں ریاستی عملداری کمزور تھی۔ ان علاقوں پر کنٹرول انہیں تربیت، منظم ہونے، اور ریاستی حملوں سے بچنے کا موقع دیتا ہے۔

نظریاتی استحکام اور اندرونی ہم آہنگی

اندرونی طور پر، متوازی اداروں کو اپنے نظریے پر سختی سے کاربند رہنا اور اپنی صفوں میں مکمل ہم آہنگی برقرار رکھنا ضروری ہے۔ کوئی بھی نظریاتی انحراف یا اندرونی پھوٹ ریاست کو مداخلت کا موقع فراہم کر سکتی ہے۔ ایک مضبوط نظریاتی بنیاد اور ڈسپلن انہیں ریاست کی جانب سے پھیلائی جانے والی تفریق اور کمزوریوں کے خلاف مزاحمت کرنے میں مدد دیتا ہے۔

مختصراً، نوزائیدہ "ریاست درون ریاست" اپنے آپ کو بچانے کے لیے سیاسی حکمت عملیوں (جیسے شمولیت)، عوامی حمایت، عسکری قوت، جغرافیائی کنٹرول، اور نظریاتی ہم آہنگی کا ایک امتزاج استعمال کرتی ہے تاکہ وہ وقت کے ساتھ اتنی قوی ہو جائے کہ یا تو ریاست کی دستبرد سے مکمل طور پر آزاد ہو جائے یا اس کی جگہ لے لے۔

پاکستان میں ریاست درون ریاست کے قیام کی ابتدا کی ضرورت

آج پوری دنیا میں سرمایہ دارانہ نظاماتی تغلب قائم اور مستحکم ہے اور عوام و خواص تحکم قانونِ سرمایہ (rule of law of capital) کی تابع داری پر مجبور ہیں۔ یہ چیز سرمایہ دارانہ زر (capitalist money) کی عالمگیریت سے بالکل عیاں ہے۔ سرمایہ دارانہ زر سود اور

غرر(Capitalist money and credit) کی تجسیم ہے اور کون ہے جو آج سرمایہ دارانہ زر کے استعمال سے گریز کر سکے۔

علماء اور اسلامی جماعتوں نے یہ بات فراموش کر دی ہے کہ سرمایہ داری میں ایک نظاماتی کلیت(systemic totality) ہے جو دھیرے دھیرے زندگی کے ہر شعبے پر سرمایہ (یعنی وہ سرمایہ دارانہ زر جو اپنی بڑھوتری کے لیے اشیا اور اجسام سے مستقل گزرتا رہتا ہے) کو مسلط کرتا جاتا ہے۔ اس عمل کو محض تعلیم و تزکیے سے ہرگز معطل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم ویسی ہی ریاست درون ریاست(state within state) بنا سکیں جیسی سرکار دو عالم نے مکہ میں تعمیر فرمائی تھی۔ ورنہ ہر مجاہد و عابد، متقی اور ہر مخلص مسلمان تحکم قانون سرمایہ کی تابع داری پر مجبور ہو جائے گا۔

طالبان عالی شان اور ایرانی علماء نے یہ کر کے دکھا دیا ہے اور الحمدللہ وہ افغانستان اور ایران میں تحکم قانون سرمایہ(rule of law of capital) کو بتدریج معطل کر رہے ہیں۔ اس عمل کو اسلامی انقلاب کہتے ہیں۔

اسلامی انقلابی عمل میں محض سیاسی جدوجہد کا نام نہیں۔ اسلامی انقلابی عمل صرف اس سیاسی جدوجہد کو کہتے ہیں جو سرمایہ دارانہ ریاستی ادارتی صف بندی کو تتر بتر کر کے سرمایہ کے نظاماتی اقتدار کو بتدریج معطل کرنے کی جدوجہد کرے۔ اس نظاماتی انہدام کے بغیر معاشرہ میں وہ گنجائشیں(spaces) پیدا نہیں کی جا سکتیں جن میں تعلیم و تزکیہ ان معنوں میں موثر ہو کہ احکام شرع پر عمل کرنا ممکن و آسان اور قانون سرمایہ کی تابع داری معطل ہوتی چلی جائے۔

اسلامی انقلابی عمل وہ عمل ہے جو عوام میں سے ایک حوصلہ مند، بااختیار اور تنفیذی قوت رکھنے والا گروہ منظم کرے اور اس گروہ کی عوامی قیادت کی ادارتی صف بندی ممکن بنائے۔

پاکستان میں یہ گروہ لازماً مخلصین دین پر مشتمل ہو گا کیونکہ یہی لوگ دین سے شعوری وابستگی رکھتے ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ان کی تعداد دو ڈھائی کروڑ ہے۔ ملک کی آبادی کا نو دس فیصد۔ یہ جماعت اسلامی کا بنیادی حلقہ constituency ہے اور ہمارا عوام سے

تخاطب براہ راست نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسی حلقے کے ذریعہ ہونا چاہیے۔ یہ بہت بڑا حلقہ constituency ہے اور اس کو منظم کرنے کا ادارتی ڈھانچہ لاکھوں مساجد کی شکل میں پورے ملک میں پھیلا ہوا ہے۔

مری جدوجہد کی بالیقیں بنیاد ہے مسجد
خدا آباد رکھے آج بھی آباد ہے مسجد

مخلصین دین کو بااقتدار بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ان میں پائے جانے والے مسلکی گروہوں میں اتحاد پیدا کیا جائے۔ غیر مسلکی اسلام کوئی چیز نہیں اور مسلکی افتراق رحمت ہے لیکن مسلکی تصادم کو سامراج نے فروغ دیا اور اس تصادم کے جاری رہنے کی ایک بڑی وجہ نظم اجتماعی میں مسلکی جماعتوں کا اسلامی تشخص کے اظہار سے گریز ہے۔ دورِ حاضر میں نظم اجتماعی کی اسلامی ترتیب کے ضمن میں مسلکی اختلافات نہ ہونے کے برابر ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر مسلک کے وابستگان کو اسلامی نظم اجتماعی کی جدوجہد کی فرضیت سے آگاہ کیا جائے اور انہیں اس فرض کفایہ کی ادائیگی کی ضرورت پر راضی کیا جائے۔ ایک ملک گیر بین المسالک وفاق المساجد قائم ہو جو مخلصین دین کو مقامی سطح پر بااختیار بنانے کا ذریعہ ثابت ہو۔ سرمایہ دارانہ مظالم کے خلاف جدوجہد اسلامی عصبیت کے فروغ کی جدوجہد سے وابستہ ہو۔ حلال رزق کی فراہمی کا اور ترسیل توانائی (پانی، بجلی اور گیس وغیرہ) کا بھی انتظام کیا جائے۔ مخلصین متحد ہو کر ایک ریاست درون ریاست قائم کریں جس کی توسیع سرمایہ دارانہ نظم اجتماعی کو کمزور کرے اور ائمہ مساجد کی قیادت میں پاکستانی معاشرہ کو غیر جمہوری خطوط پر مرتب کرنے کا ذریعہ بنے۔ جماعت اسلامی اور دیگر اسلامی جماعتوں کے ریاستی اقدام انتخابات اور احتجاجات کا مقصد اس متبادل نظم اجتماعی کے دائرۂ کار کی توسیع ہو۔ یوں مخلصین دین بااختیار بنتے چلے جائیں گے اور ان کے معاشرتی اقتدار کا فروغ بتدریج عوام میں احساسِ لاچارگی اور بے بسی کو رفع کرتا رہے گا جس کا نتیجہ بالآخر اسلامی ریاست کے قیام کی صورت میں ظاہر ہو گا۔ ان شاء اللہ۔

معیشت، معاشرت، سیاست

آئی ٹی اور جمہوریت

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

انٹرنیٹ کو بعض محققین دورِ حاضر کا معاشرتی دماغ (social brain) کہتے ہیں، کیونکہ یہ اجتماعی معاشرتی فکر کی ترتیب کا ذریعہ ہے۔ لیکن عملاً یہ ترتیب اجارہ دار کارپوریشنوں کے توسط سے قائم کی جاتی ہے۔ گوگل، ایپل، فیس بک، مائیکروسافٹ، ایمازون وغیرہ انٹرنیٹ پر چھائی ہوئی ہیں اور رائے عامہ کی تخلیق بھی کر رہی ہیں۔ یہ امریکا اور دیگر سامراجی حکومتوں کی عالمی جاسوسی اور تخریب کاری کو ممکن بنا رہی ہیں، نیز سود اور سٹے کے حرام خور کاروبار (کی جدید شکل یعنی فنانس) کے پھیلاؤ کا بنیادی وسیلہ بھی بن گئی ہیں۔

اپنی ابتدا کے وقت سے آج تک انٹرنیٹ پر سامراج کا قبضہ ہے۔ سرد جنگ کے دور میں امریکی فوج نے انٹرنیٹ ایجاد کیا اور ۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ء کی دہائی میں اطلاعات کی برقی فراہمی کو جب ایک کاروبار بنا دیا گیا تو اس میدان میں سرمایہ دارانہ اجارہ داریوں کا عروج بھی ممکن ہو گیا۔ آئی ٹی صنعت میں کارپوریشنوں کی اجارہ داریاں اور سامراجی ریاست کی تخریب کاریاں ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔

لیکن آج یہ اجارہ داریاں اطلاعات کی بھرمار (big data) کو پورے طور پر کنٹرول نہیں کر پا رہی ہیں۔ بِگ ڈیٹا ہزاروں تجارتی مواصلاتی کمپنیوں کے پاس جمع ہوتا جا رہا ہے۔ بِگ ڈیٹا کے کنٹرول اور ترتیب کے لیے گوگل فائل سسٹم ایجاد کیا گیا ہے۔ لیکن انٹرنیٹ کے ذریعہ کروڑوں افراد اپنی آرا کا اظہار کر رہے ہیں اور ان کروڑوں میں بہت سوں نے معاشرتی اور سیاسی روابط قائم کر لیے ہیں۔ یوں انٹرنیٹ کے ذریعے سرمایہ دارانہ معاشرتی مکالمہ بہت وسیع ہو گیا ہے۔

عوام میں سے بہت سے لوگ جو پہلے بے زبان تھے اب انہیں بولنے کا موقع مل گیا ہے۔ اطلاعاتی اجارہ داریوں کی کوشش ہے کہ زیادہ سے زیادہ اطلاعات کو سرمایہ دارانہ ملکیت میں

تبدیل کر لیں اور قوانینِ فکری ملکیت (intellectual property rights) کے ذریعے زیادہ سے زیادہ اطلاعات کو سرمایہ دارانہ گردشی چکر میں سمولیں۔

سترھویں اور اٹھارھویں صدی کے یورپی اور امریکی انقلابات کے بعد سے سرمایہ دارانہ ریاست کے غلبے نے جمہوریت کا سہارا لیا ہے۔ جمہوری عمل کے ذریعہ ہی سرمایہ دارانہ غلبے کا جواز (legitimation) مرتب کیا جاتا ہے۔ لیکن جمہوری عمل دو دھاری تلوار ہے۔ جمہوری عمل کے ذریعہ سرمایہ دارانہ غلبے کا جواز بھی فراہم کیا جاسکتا ہے اور سرمایہ دارانہ غلبے کو چیلنج بھی کیا جاسکتا ہے۔ سرمایہ دارانہ زعما کی کوشش ہے کہ انٹرنیٹ کے ذریعہ ایسی جمہوری فضا پیدا ہو جہاں سرمایہ دارانہ ذہنیت اور اس کی حاکمیت کی نفی ناممکن ہوتی چلی جائے۔

ڈیجیٹلائزیشن کے ذریعہ عوامی خواہشات کی بنیاد پر ریاستی اور کارپوریٹ پالیسیاں مرتب کی جا رہی ہیں اور یوں عوامی عمل کو بالواسطہ کنٹرول کیے بغیر عوام کی نگہداشت اور ان کی خواہشات کی تکمیل کو ممکن بنایا جاسکتا ہے۔ لیکن چونکہ ریاستی اور کارپوریٹ پالیسی سازی کا حتمی مقصد سرمایہ دارانہ نظام میں بڑھوتریٔ سرمایہ کے علاوہ اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا لہٰذا ڈیجیٹلائزیشن اس وقت تک ہی کارفرما ہو سکتی ہے جب عوام کی خواہشات بڑھوتریٔ سرمایہ کی جستجو سے ہم آہنگ کی جائیں۔ لہٰذا آئی ٹی کی وسعت اور افادیت کو فروغ دینے کے لیے ضروری ہے کہ عوام کی خواہشات سرمائے میں مسلسل اضافے پر مرکوز ہوں۔ اگر ایسا نہ ہو تو نہ ڈیجیٹلائزیشن ممکن ہے نہ آئی ٹی کی سرمایہ دارانہ کارفرمائی ممکن ہے۔ آئی ٹی کا استعمال ان ہی معنوں میں جمہوری عمل کی توسیع ہے۔

جمہوری عمل کے اجرا اور اس کے نفاذ کا مطلب یہ نہیں کہ عوام سرمایہ دارانہ نظام میں حاکم بن جائیں۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ بڑھوتری کی پالیسی سازی کو عوامی تائید حاصل ہوتی رہے، اور آئی ٹی کے اطلاق کے ذریعے یہ تائید مسلسل حاصل کرتے رہنا ممکن ہے۔ بشرطیکہ آئی ٹی کے پھیلاؤ سے عوامی خواہشات کو سرمایہ دارانہ ذہنیت کے تابع کیا جاسکے۔

آئی ٹی کا فروغ ریاست کی عوام پر نگرانی کی صلاحیت میں مستقل اضافہ کر رہا ہے۔ سرمایہ داروں کے لیے افرادی سوچ اور عمل کو ڈھالنا آسان ہو گیا ہے اور فکر و عمل کی یہی تخریب کاری کارپوریشنوں اور ریاستوں کے غلبے اور نفوذ کا ذریعہ بن رہی ہے۔ بڑی کارپوریشنیں آئی ٹی کے استعمال کے ذریعہ عوام کی خواہشات تخلیق کرنے کے قابل ہو گئی ہیں۔ امریکی فوج کی ایک رواں تحقیق کا ہدف آئی ٹی کے ذریعہ انسانی شخصیت میں اپنے جاہلی شیطانی عزائم کے مطابق تبدیلی لانا ہے۔ سوچ پر قبضہ کرنا آئی ٹی کارپوریشنوں اور امریکی اور چینی افواج کا ایک اہم ہتھیار بن گیا ہے۔

آئی ٹی کے پھیلاؤ کے نتیجے میں سرمایہ دارانہ ذہنیت کی تائید ہر فرد کی جبلّتی کیفیت بنتی جا رہی ہے اور بڑی حد تک عوام وہ پسند کرنے لگے ہیں جو سرمایہ دارانہ ریاست اور سرمایہ دارانہ کارپوریشن چاہتی ہیں۔ یوں سرمایہ دارانہ جمہوریت قومی تشخص میں مقید ہونے کے باوجود آفاقی ہو جاتی ہے۔ اشتراکی سرمایہ دار اس نوزائیدہ آئی ٹی جمہوریت کو نجی اجارہ دار کارپوریشن کی گرفت سے آزاد کرانا چاہتے ہیں، لیکن جیسا کہ چین کے تجربے سے ثابت ہے اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ آئی ٹی کی صنعت کی حاکمیت نجی کارپوریشنوں کے ہاتھ سے نکل کر سرکاری کارپوریشنوں کے ہاتھوں میں مرتکز ہو جائے۔ اس تبدیلیٔ اقتدار سے اس صنعت کی نہ ماہیت تبدیل ہو گی نہ سود خور (فنانشل) مارکیٹوں پر اس کا انحصار کم ہو گا۔

جمہوریت خواہ نیولبرل، خواہ اشتراکی، ہر حال میں سرمایہ دارانہ انفرادیت سازی کا ذریعہ ہی رہے گی اور آئی ٹی صنعت کی ملکیت میں تبدیلی اس کے معاشرتی اور سیاسی کردار کو تبدیل نہ کر سکے گی۔ اشتراکی سرمایہ دار ان عوامی مزاحمتی تحریکوں سے امیدیں باندھتے ہیں جو موجودہ دہائی میں فرانس، چلی، بیلاروس وغیرہ میں برپا ہوئیں اور جن کو مہمیز دینے میں انٹرنیٹ کا اہم کردار تھا۔ لیکن ان تحریکوں میں سرمایہ دارانہ ذہنیت کا اظہار ہوتا ہے اور ان کا عوامی اظہار حرص سے مغلوب ہوتا ہے۔ ان کے نتیجہ میں نظام میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی بلکہ سرمایہ دارانہ جمہوریت مزید مستحکم ہو جاتی ہے۔

آئی ٹی اور مصنوعی ذہانت (artificial intelligence) کی مقبولیت کے ذریعے سرمایہ دارانہ طرز عمل (work process) میں تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔ پیداواری عمل میں مشینیں انسانوں کی جگہ لے رہی ہیں اور کارکن پیداواری عمل کو کنٹرول اور ریگولیٹ کرنے والے بنتے جارہے ہیں لیکن یہ کارکن کنٹرول اور ریگولیشن کو سرمایے میں اضافے کے لیے ہی استعمال کر رہے ہیں۔ لہٰذا خود کاری automation کے نظاماتی پھیلاؤ سے سرمایہ دارانہ جمہوریت کی نوعیت میں تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ کارکن محکوم ہی رہتا ہے اور سرمایہ کی بالادستی کا قانون معطل نہیں ہوتا۔

کم از کم فی الحال بہت سے ایسے شعبے ہیں جہاں آئی ٹی اور مصنوعی ذہانت کا اطلاق مشکل اور محدود ہے۔ اس کے نتیجے میں کلی اور جزوی بیروزگاری پھیل رہی ہے اور آبادی کا ایک بڑھتا ہوا حصہ سرمایے کے پیداواری اور بڑھنے کے عمل سے خارج کیا جارہا ہے۔ اس کے باوجود وہ سرمایہ دارانہ اشیائی (commodity) اور سود خور مارکیٹوں سے بدستور منسلک رہتے ہیں۔

بے روزگاری اور نیم بے روزگاری کے پھیلاؤ کے نتیجے میں سرمایہ دارانہ جمہوری ریاست (کارپوریشنوں کے مقابلہ میں) قدرے مضبوط ہوتی جائے گی اور سوشل ڈیموکریٹک اور سوشلسٹ پالیسیاں کسی نہ کسی حد تک نیولبرل پالیسیوں کو معطل کرتی جائیں گی اور جہاں بھی اور جس حد تک یہ تبدیلی رونما ہو گی وہاں سرمایہ دارانہ جمہوری نظام کی ترتیب نو عمل میں آئے گی۔

لیکن اس عمل سے سرمایہ دارانہ جمہوریت معطل ہونے کا کوئی امکان موجود نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سوشل ڈیموکریٹ اقدامات کے نتیجے میں آئی ٹی کارپوریشنوں کے ڈیٹا سسٹم اور ایلگورڈمک کنٹرول کے نظاموں تک ایک آدمی کو رسائی حاصل ہو جائے اور کسی نہ کسی حد تک ایک عام آدمی آئی ٹی کے استعمال کو سیلف ریگولیٹ کرنے کے قابل ہو جائے لیکن جب تک اس سیلف ریگولیٹری نظام کا مقصد حرص کا فروغ رہے گا اس وقت تک سرمایہ دارانہ جمہوریت غالب رہے گی۔

اسی طرح فیس بک، گوگل اور ایمازون جیسی کمپنیوں اور الیکٹرونک اور سوشل میڈیا کو قومی تحویل میں لینے اور ان شعبوں میں نجی ملکیت کو سرکاری ملکیت سے تبدیل کرنے کا نتیجہ سرمایہ دارانہ جمہوریت کی تردید کی صورت میں برآمد نہ ہو گا کیونکہ ریاستی ملکیت کی کارفرمائی کا مقصد سرمائے میں مسلسل اضافے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو گا۔

اشتراکی سرمایہ داری، لبرل سرمایہ داری کا تسلسل ہے۔ اس کا تصور حیات و کائنات تحریک تنویر (enlightenment) کے مفروضات اور بیانیے کی مادی تشریح کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ وہ انہی اقدار یعنی آزادی، ترقی اور مساوات کے اجتماعی حصول کے لیے جدوجہد کی متقاضی ہے جن کو لبرل ازم انفرادی سطح پر حاصل کرنا چاہتا ہے۔ نہ لبرل ازم کو اس بات کا شعور ہے نہ اشتراکیت کو اس بات کا ادراک ہے کہ سرمایہ دارانہ بحرانوں (اطلاعاتی، ماحولیاتی، وبائی، علمیاتی، معاشی، معاشرتی) کا اصل سبب روحانی ہے، یہ کسی خاص نظام اور اس کے ڈھانچے سے وابستہ نہیں۔ سرمایہ داری انسانیت اور کائنات کو اس لیے تباہ کر رہی ہے کہ فرد سرمایہ کا غلام یعنی حرص کے شیاطین کا پجاری بن گیا ہے۔ جب تک یہ پوجا جاری رہے گی کائناتی بحران مزید گہرے ہوتے چلے جائیں گے۔ ان بحرانوں اور ان کی مختلف صورتوں مثلاً سرمایہ دارانہ جمہوریت سے نجات حاصل کرنی ہے تو پوری دنیا کو اسلام کے نور سے منور کرنے کی جدوجہد کرنی چاہیے۔ یہی ہم اسلامی انقلابیوں کا اصل فریضہ ہے۔

نوٹس

انٹرنیٹ کی جڑیں امریکی فوج کے ARPANET (Advanced Research Projects Agency Network) منصوبے میں ہیں جو سرد جنگ کے دوران شروع ہوا، لیکن اس کا وسیع اطلاق اور عوامی استعمال ۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ء کی دہائی میں ہوا، جب اسے کاروباری شکل دی گئی۔

جدید سائنسی ترقی کا فریب اور دنیاوی ترقی کا خواب

سید محمد یونس قادری

smyounus121@gmail.com

نوٹ: یہ مضمون سائنس اور ٹیکنالوجی کو اسلامی نقطۂ نظر سے سمجھنے کی ایک ابتدائی اور جزوی کوشش ہے۔ اس سلسلے میں مزید کوششیں درکار ہیں۔

سائنسی ترقی یا سرمایہ دارانہ علمیت کا غلبہ؟

جدید دور میں سائنسی ترقی نے انسان کو حیرت انگیز کامیابیاں عطا کی ہیں، جیسے چاند پر قدم رکھنا اور مصنوعی ذہانت (AI) کی تخلیق، جس نے انسانی عقل کو نئی جہات سے روشناس کرایا ہے۔ ان ایجادات اور پیش رفتوں نے یہ باور کرایا ہے کہ دنیا کی تمام حقیقتیں محض تجرباتی اور حادثاتی ہیں، اور کائنات کی تخلیق کسی مقصد کے بغیر ایک حادثاتی عمل کا نتیجہ ہے۔ اس نقطۂ نظر کے تحت، انسان خود کو اس دنیا کا خالق اور اپنی تقدیر کا مالک تصور کرنے لگا ہے۔

لیکن آج کے دور میں جس "سائنس" کو ہم ترقی، روشنی اور آزادی کی علامت سمجھتے ہیں، وہ درحقیقت ایک مخصوص تہذیبی و معاشی نظام کی خدمت گزار ہے۔ جدید سائنس محض فطرت کے مشاہدے یا حقیقت کے حصول کا غیر جانبدار عمل نہیں، بلکہ یہ سرمایہ دارانہ نظام کی "فعّال معرفت" (Functional Epistemology) ہے۔ یہ علم ایک مخصوص مقصد کے تحت تشکیل پایا ہے: دولت، طاقت، اور کنٹرول کا مسلسل ارتکاز۔

سائنس کی ترقی کو آزادی، مساوات اور ترقی جیسے بلند بانگ نعروں کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے، لیکن حقیقت میں یہ ترقی ایک خاص مقصد کے تحت ہو رہی ہے — یعنی سرمایہ کا ارتکاز برائے ارتکاز (Accumulation for the sake of accumulation)۔ ٹیکنالوجی کے ساتھ اس گٹھ جوڑ نے اسے محض "سائنس" نہیں بلکہ "ٹیکنو-سائنس" بنا دیا ہے، جس کی قدریں وہی ہیں جو سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد ہیں: بے لگام آزادی، ذاتی مفاد، اور

لامتناہی ترقی۔

سرمایے کی اطاعت اور دنیاوی مادیات کا فریب

مغربی فکر میں عقل کو حتمی معیار مان کر وحی کو پسِ پشت ڈال دیا گیا۔ دیکارٹ سے لے کر کانٹ تک، عقل کو نہ صرف انسان کا مرکز بنایا گیا بلکہ اسے حقیقت کا واحد ماخذ تسلیم کیا گیا۔ یہی سوچ سائنس کی بنیاد بنی، جس نے فطرت کو محض قابو پانے کی شے (object of control) بنا دیا۔

لیکن غور کیا جائے تو یہ عقل بھی آزاد نہیں ہے — یہ سرمایہ دارانہ مقاصد کی خادمہ ہے۔ تجربہ، مشاہدہ، اور منطق کا وہی استعمال معتبر ٹھہرتا ہے جو کسی نفع بخش ٹیکنالوجی یا منڈی کی ترقی میں مدد دے۔ اس طرح سائنس ایک "آزاد علم" کے بجائے ایک "خدمت گزار نظام" بن چکی ہے جو سرمائے کے مفاد میں مسلسل کام کرتا ہے۔

سائنس کے حاملین مذہبی ریاستوں پر الزام لگاتے ہیں کہ ان کے ادوار میں انسان ترقی نہیں کر سکتا، لیکن سائنسی علوم کے پروان چڑھنے کے بعد انسان نے دنیاوی ترقی کی معراج تک پہنچ کر اپنی دنیا کو "جنت" بنانے کا خواب دیکھنا شروع کر دیا۔ مصنوعی ذہانت، انٹرنیٹ اور دیگر جدید ایجادات نے انسان کو ایک ایسا نظام فراہم کر دیا جہاں ہر چیز محض مادی فوائد اور حصولِ ثروت سے منسوب ہو گئی ہے۔ یہ نظام انسان کو اپنے وجود کی اصل حقیقت سے کاٹ کر صرف دنیاوی مفادات اور عارضی کامیابیوں کا غلام بنا دیتا ہے۔

عقل کی خود مختاری (ریشنیلیٹی) اور سائنس کا ظہور

عقل کی مرکزیت: ایمانوئل کانٹ نے اخلاقی اصولوں کی تشکیل میں ریشنیلیٹی کو مرکزی حیثیت دی، جس سے انسان اپنے فیصلے منطق اور دلیل کی بنیاد پر اپنے ذہن سے کرنے لگا۔ مغربی فلسفہ نے یہ مان لیا کہ انسانی عقل (ریشنیلیٹی) وہ واحد ذریعہ ہے جس سے حقیقت کا ادراک ممکن ہے۔ رینی دیکارٹ (René Descartes) کا معروف قول "Cogito,

ergo sum"(میں سوچتا ہوں، پس میں موجود ہوں) اس بات کی دلیل ہے کہ عقل ہی انسانی وجود کی بنیاد ہے۔ فلسفوں نے تجربے، مشاہدے اور منطق پر مبنی تحقیق کو فروغ دیا۔ انسانی عقل نے قدرتی دنیا کے قوانین کو دریافت کرنے کے لیے تجرباتی طریقے اپنائے، جس سے سائنس کی بنیاد پڑی۔ وحی اور مذہبی روایت کی بجائے، مغربی فلسفہ نے عقل کی مدد سے کائنات کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کی، جس سے سائنس ایک آزاد اور خود مختار علم کے طور پر ابھرا۔

سائنس کی خصوصیات: سائنس میں حقیقت تک پہنچنے کے لیے منطق اور استدلال کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اصول اور قوانین تجربات کی روشنی میں وضع کیے جاتے ہیں اور انہیں بار بار جانچ کر تسلیم کیا جاتا ہے۔ سائنس کا ایک اہم جزو تجرباتی عمل ہے۔ قدرتی مظاہر کو بار بار مشاہدہ اور تجربات کے ذریعے جانچا جاتا ہے، جس سے قابلِ تصدیق نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ چونکہ انسانی عقل محدود ہے اور نئے تجربات و مشاہدات سے علم میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، سائنس بھی مسلسل ترقی کرتی ہے۔ نئے نظریات پرانے نظریات کی جگہ لے لیتے ہیں جب ان کے حق میں مضبوط ثبوت ملتے ہیں۔ مغربی فلسفے میں انسان کو اپنی تقدیر خود بنانے والا سمجھا گیا، جس کے تحت سائنس نے نہ صرف قدرتی قوانین کو سمجھنے بلکہ انسانی وجود، ٹیکنالوجی اور معاشرتی ترقی کو بھی نیا رخ دیا۔ اگرچہ سائنس بنیادی طور پر قدرتی دنیا کے قوانین کی جانچ پر مبنی ہے، لیکن اس نے اخلاقیات اور سماجی اصولوں کے جدید نظریات کی تشکیل میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ انسانی عقل کے ذریعے اخلاقی اور معاشرتی مسائل کو بھی نئی جہت ملتی ہے۔ نتیجتاً مغربی فلسفے نے عقل کو خود مختار مان کر وحی سے آزاد علم کی تشکیل کی راہ ہموار کی، جس کا نتیجہ جدید سائنس کی شکل میں نکلا۔

سائنسی طریقہ کار(Scientific Method): جدید سائنس ایک منظم اور باقاعدہ طریقہ کار کے تحت کام کرتی ہے، جسے "سائنسی طریقہ کار" کہا جاتا ہے۔ یہ طریقہ علم کے حصول اور اس کی توثیق کے لیے ایک مرحلہ وار عمل فراہم کرتا ہے، جو سچائی تک پہنچنے کا ایک قابلِ

اعتماد ذریعہ ہے۔ سب سے پہلے کسی مظہر کا باریک بینی سے مشاہدہ (Observation) کیا جاتا ہے، جس سے ایک مخصوص سوال (Question) پیدا ہوتا ہے کہ یہ مظہر کیوں یا کیسے رونما ہوا۔ اس سوال کے جواب کے طور پر ایک مفروضہ (Hypothesis) پیش کیا جاتا ہے، جو کہ ایک ممکنہ وضاحت ہوتی ہے۔ اس مفروضے کی جانچ کے لیے تجربہ (Experiment) کیا جاتا ہے تاکہ عملی شواہد حاصل کیے جا سکیں۔ تجربے کے بعد نتائج (Conclusion) اخذ کیے جاتے ہیں، اور ان نتائج پر نظرِ ثانی اور تصدیق (Review and Verification) کی جاتی ہے تاکہ ان کی صداقت اور تکرار (Replicability) کا اطمینان ہو سکے۔

یہ طریقہ کار نیوٹن، گلیلیو، اور فرانسس بیکن جیسے مفکرین کے نظریات سے اخذ کیا گیا، جنہوں نے عقلی مشاہدے، تجربے، اور منطقی استدلال کو علم کی بنیاد قرار دیا۔ مثلاً نیوٹن نے سیب کے گرنے کا مشاہدہ کر کے سوال اٹھایا کہ چیزیں زمین کی طرف کیوں کھنچتی ہیں، جس کے نتیجے میں اُس نے کششِ ثقل کا مفروضہ پیش کیا، پھر تجربات اور مشاہدات کی مدد سے اسے ثابت کیا، جو بعد میں نیوٹن کے قوانین کی بنیاد بنا۔ اس مثال سے واضح ہوتا ہے کہ سائنسی طریقہ محض اتفاقی تلاش نہیں، بلکہ ایک مربوط اور عقلی عمل ہے جو علم کو مادی اور تجرباتی بنیاد پر استوار کرتا ہے۔

جدید سائنسی نظریات: علم یا سرمایہ کی خدمت؟

آج جس سائنسی نظریے کو غیر جانب دار اور خالص عقلی حقیقت سمجھا جاتا ہے، دراصل وہ سرمایہ دارانہ نظام کی ترجیحات اور مفادات کا آئینہ دار ہے۔ آگسٹ کومٹے کے پوزیٹوزم نے صرف تجرباتی علم کو معتبر قرار دے کر وحی اور مابعد الطبیعات کو خارج کر دیا۔ کارل پوپر کے فالسیفی کیشن اصول نے سچائی کو "رد کیے جانے کی صلاحیت" تک محدود کر دیا، جس کے نتیجے میں مذہبی حقائق سائنسی دائرے سے نکال دیے گئے۔

یہ تصور کہ صرف وہی علم قابلِ قبول ہے جو سرمایہ کے لیے مفید ہو، مغربی مفکرین کی سوچ

میں جابجا نظر آتا ہے۔ مثلاً برٹرینڈ رسل اور رچرڈ ڈاکنز نے سائنس کو خدا کے تصور کے خلاف استعمال کیا، گویا سائنس ایک نظریاتی ہتھیار بن چکی ہے۔ نٹشے کا اعلان "خدا مر چکا ہے" درحقیقت ایک تہذیبی الحاد کی نمائندگی کرتا ہے جو سرمایہ دارانہ مفادات کے تحت مذہب کو ختم کرنے کی جدوجہد ہے۔

یہی سائنس اب ٹیکنالوجی کے ساتھ مل کر "ٹیکنو-سائنس" بن چکی ہے۔ اس کا مقصد صرف علم کا اضافہ نہیں بلکہ منڈی کے لیے قابلِ فروخت مصنوعات، قابلِ استحصال انسان، اور قابو پانے کے قابل وسائل پیدا کرنا ہے۔ اس کی قدریں وہی ہیں جو سرمایہ داری کی ہیں: لامتناہی ترقی، آزادی برائے آزادی، اور مساوات برائے منافع۔

سائنسی ترقی (ٹیکنو-سائنس) کے اثرات: بگاڑ، استحصال اور زوال

ٹیکنو-سائنس نے جہاں دنیا کو سہولتیں دیں، وہاں ایک گہرا زہریلا اثر بھی چھوڑا ہے۔ صنعتوں، فیکٹریوں، اور مشینوں نے قدرت کو صرف ایک خام مال بنا کر رکھ دیا، جس کے نتیجے میں ماحولیاتی تباہی پیدا ہوئی۔ سورۃ الروم کی آیت ۴۱— ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ... — بالکل اس صورت حال کی وضاحت کرتی ہے۔ یہ فساد دراصل اس نظام کا فطری نتیجہ ہے جو ترقی کو صرف مادی اضافے اور پیداوار کے تناظر میں دیکھتا ہے۔

یہی سائنس جب انسانی نفسیات پر اثر انداز ہوتی ہے، تو اس کا نتیجہ خود پسندی، خود مختاری کے زعم، اور الحاد کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ نٹشے، سارتر، اور فرائیڈ جیسے مفکرین نے انسان کو اپنی تقدیر کا خالق قرار دیا، جس سے ایک ایسا معاشرہ وجود میں آیا جس میں انسان اپنی خواہشات کا غلام بن گیا۔ فرائیڈ نے صاف کہا کہ عقل دراصل دبے ہوئے جذبات اور نفسیاتی خواہشات کا نقاب ہے، اور ہیوم کے بقول "Reason is, and ought only to be the slave of the passions"—تو پھر سوال یہ ہے: یہ سائنس کس کی غلام ہے؟

جواب واضح ہے: سرمایہ، طاقت، اور کنٹرول کی۔ اس سائنس کا ہر قدم سرمایہ دارانہ مفادات کی تکمیل میں اُٹھتا ہے، اور ہر ایجاد کا ہدف مارکیٹ کا پھیلاؤ اور منافع کا ارتکاز ہوتا ہے۔ یہ علم

نہیں بلکہ ایک آلۂ استحصال ہے۔

سائنسی ترقی اور تسخیرِ کائنات کا مقصد

کہا جاتا ہے کہ سائنس کا مقصد کائنات کو سمجھنا، فطرت پر قابو پانا، اور انسان کے لیے ایک بہتر دنیا بنانا ہے، لیکن آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہی ترقی ماحولیات، معاشرت، اور انسانی نفسیات پر منفی اثرات مرتب کر رہی ہے۔ سائنس نے انسان کو کائنات کے راز جاننے اور فطرت کو قابو میں لانے کا موقع دیا۔ صنعتی انقلاب ((Industrial Revolution کے بعد دنیا میں مشینی ترقی، ایجادات، اور سہولتوں میں اضافہ ہوا۔ سائنس کا ایک نظریہ یہ تھا کہ اگر ہر انسان کو جدید سہولیات ملیں تو دنیا جنت بن سکتی ہے۔ مگر اس ترقی نے صرف چند اقوام کو فائدہ پہنچایا، جبکہ غریب ممالک مزید پسماندہ ہو گئے۔ جدید ترقی کے منفی نتائج یہ ہیں کہ دنیا جنت کی بجائے جہنم بن گئی۔

انسانی نفسیات پر اثرات: خود پسندی اور "خدائی" دعوے

سائنس اور ٹیکنالوجی نے انسانی زندگی کو سہولتوں سے بھر دیا، لیکن اس کے ساتھ ہی انسان میں خود پسندی (Narcissism) اور خود مختاری کا زعم پیدا ہوا۔ فلسفی ژاں پال سارتر ((Jean-Paul Sartre اور فرائیڈ ((Freud نے انسان کو اپنی تقدیر کا خود خالق قرار دیا، جو کہ خود پرستی (Egoism) اور سائنس پر اندھا اعتماد پیدا کرتا ہے۔ نتیجتاً انسانی نفسیات بگڑتی گئی، اور لوگ ذہنی امراض جیسے شیزوفرینیا، ڈیپریشن اور اینزائٹی میں مبتلا ہونے لگے۔

ماحولیاتی آلودگی—ترقی کی قیمت

صنعتی ترقی نے زائد پیداوار (Overproduction) اور بے تحاشا استعمال (Overconsumption) کو جنم دیا۔ بڑے ممالک جیسے امریکہ، یورپ، اور چین دنیا کی ۸۰٪ سے زیادہ توانائی، تیل، اور وسائل استعمال کر رہے ہیں، جبکہ ان کی آبادی دنیا کا صرف 10-15% ہے۔ اگر پوری دنیا یورپ اور امریکہ کے معیار پر ترقی یافتہ ہو جائے تو زمین کے

وسائل ختم ہو جائیں گے، درجہ حرارت خطرناک حد تک بڑھ جائے گا، اور ماحولیاتی تباہی برپا ہو جائے گی۔ گلوبل وارمنگ اور قدرتی آفات فیکٹریاں، کاریں، اور انڈسٹریز گرین ہاؤس گیسز پیدا کر رہی ہیں، جس سے زمین کا درجہ حرارت بڑھ رہا ہے۔ گلیشیئرز پگھل رہے ہیں، سمندری سطح بلند ہو رہی ہے، اور شدید موسمی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ سائنس جس نے "تسخیرِ کائنات" کا خواب دکھایا تھا، آج زمین کو ناقابلِ رہائش بنانے میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔

غیر مساوی ترقی اور استحصال

سائنس کی ترقی سے صرف چند ممالک امیر ہوتے گئے، جبکہ غریب ممالک مزید پسماندہ ہو گئے۔ جدید سرمایہ داری (Capitalism) نے دولت کی غیر مساوی تقسیم کو مزید بڑھایا، جس سے امیر ممالک مزید ترقی یافتہ ہوئے اور غریب ممالک استحصال کا شکار ہوئے۔ عالمی سیاست اور جنگیں بھی سائنسی ترقی کی پیداوار ہیں، جیسے ایٹمی ہتھیار اور جدید ٹیکنالوجیز جو صرف طاقتور اقوام کے مفاد میں استعمال ہو رہی ہیں۔ اگر پوری دنیا یورپ کی طرح ترقی یافتہ ہو جائے؟ یہ ایک اہم سوال ہے: اگر ہر ملک یورپ اور امریکہ جیسا ترقی یافتہ ہو جائے تو کیا ہو گا؟ دینا میں قیامت آ جائے گی۔ سائنس نے انسان کو بے شمار سہولتیں دیں، مگر اگر اسے اخلاقیات اور فطرت کے اصولوں کے بغیر چھوڑ دیا جائے تو یہ دنیا کو جہنم بنا سکتی ہے۔ آج ہم اسی راستے پر ہیں جہاں سائنس، سرمایہ داری، اور غیر محدود ترقی کی دوڑ نے دنیا کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔

قرآنی تناظر: ٹیکنو-سائنس کے مقابل اسلامی علم و ترقی کا نظریہ

جدید ٹیکنو-سائنس جس قدر انسان کو مادی سہولتیں مہیا کرتی ہے، اسی قدر اسے روحانی، اخلاقی اور سماجی زوال کی طرف بھی لے جاتی ہے۔ یہ صرف حادثاتی نہیں بلکہ ایک لازمی نتیجہ ہے اُس تصورِ علم کا جو وحی سے منقطع ہو چکا ہے اور صرف عقل، مشاہدہ، اور سرمایہ کی

خدمت کو ہی علم کا معیار سمجھتا ہے۔ قرآن مجید اس فکری و تہذیبی انحراف کو نہ صرف پہچانتا ہے بلکہ اس پر کڑی تنقید بھی کرتا ہے۔

كَلَّا إِنَّ الْإِنْسَانَ لَيَطْغَىٰ أَن رَّآهُ اسْتَغْنَىٰ

ہر گز نہیں، انسان سرکشی کرتا ہے جب وہ اپنے آپ کو بے نیاز سمجھنے لگتا ہے۔

(سورۃ العلق ۶-۷)

یہ آیت محض انفرادی غرور پر تنقید نہیں بلکہ اُس "خود مختار انسان" کے نظریے کو رد کرتی ہے جو ٹیکنو-سائنس کی بنیاد ہے۔ مغربی فلسفے میں انسان کو "autonomous agent" مانا گیا ہے، جو کسی وحی، الٰہی ضابطے یا دینی اخلاقیات کا پابند نہیں۔ قرآن اس سوچ کو سرکشی قرار دیتا ہے۔ اسی طرح سورۃ الروم کی یہ آیت:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ...

خشکی اور سمندر میں فساد پھیل گیا، لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے۔ (سورۃ الروم ۴۱)

یہ محض ایک اخلاقی انتباہ نہیں بلکہ ماحولیاتی، تہذیبی، اور اقتصادی بحران کا ایک جامع تجزیہ ہے۔ ٹیکنو-سائنس کا وہ نظام جس میں پیداواری نظام، ماحولیاتی استحصال، اور وسائل کا غیر منصفانہ استعمال ہے، قرآن اسے "فساد" سے تعبیر کرتا ہے۔

سرمایہ دارانہ سائنس کی ایک اہم خصوصیت دولت کا ارتکاز ہے، جسے قرآن سختی سے رد کرتا ہے:

كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ

تاکہ دولت صرف مالداروں کے درمیان نہ گھومتی رہے۔ (سورۃ الحشر ۷)

یہ آیت سرمایہ دارانہ ترقی کے بنیادی منطق یعنی "accumulation for the sake of accumulation" کے خلاف ہے، جو ٹیکنو-سائنس کا حقیقی محرک ہے۔ مزید برآں:

وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ

اور حد سے تجاوز نہ کرو، اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (سورۃ الاعراف ۳۱)

یہ آیت ٹیکنو-سائنس کے بے حد استعمال، overproduction، اور overconsumption کے خلاف ایک الٰہی ضابطہ ہے، جو ترقی کو توازن اور عدل کے تابع کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

اسلامی تصورِ علم، سائنس کو صرف عقل کی پیداوار نہیں مانتا، بلکہ اسے وحی کی رہنمائی کے تحت محدود کرتا ہے۔ علم کا مقصد صرف مادی ترقی نہیں بلکہ روحانی بلندی، سماجی عدل، اور فطری توازن ہے۔ اس لیے اسلامی تہذیب میں علم، طاقت یا نفع کا آلہ نہیں بلکہ ایک امانت ہے جو انسان کو اللہ کی معرفت اور بندگی تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔

عقل ایک آلہ ہے اور مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ وہ مقصد کیا ہے جس کے حساب سے یہ آلہ کام کرے گا۔ اگر عقل خواہشات یا نفس کی غلام ہے تو سائنس ایسی ایجادات کرے گی جس سے انسان اس دنیا میں اپنی زیادہ سے زیادہ خواہشات، لذات کو حاصل کر سکے۔ ایسی ٹیکنولوجی کا استعمال کرے گی جس سے انسان اس دنیا میں جنت کی تعمیر کر سکیں۔ سائنس انسان کو اپنے نفس کے تابع کر کے شیطان کا غلام بنا دیتی ہے اور اسے نفس امارہ کے سپرد کر دیتی ہے، جس سے اس کا ضمیر (نفس لوامہ) مردہ ہو جاتا ہے۔ اسلام اس عقل کو وحی کے تابع کر کے نفس مطمئنہ کے حصول میں رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ مغربی فلسفے نے ابتدا میں عقل کو مطلق سچائی کے واحد ذریعہ کے طور پر پیش کیا، مگر وقت کے ساتھ ساتھ خود مغربی مفکرین نے اس نظریے کو مسترد کر دیا۔ اسلام کا موقف ہمیشہ یہی رہا کہ عقل ایک محدود صلاحیت ہے جو وحی کی رہنمائی کے بغیر گمراہ ہو سکتی ہے۔ لہٰذا، اصل علم وہی ہے جو اللہ کی طرف سے وحی کے ذریعے حاصل کیا جائے، نہ کہ محض انسانی عقل پر انحصار کر کے۔ اسلامی تعلیمات میں عقل کو ایک اہم اور ضروری ذریعہ مانا جاتا ہے، لیکن اس کو وحی کے تابع قرار دیا گیا ہے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر انسان کو فکر و تدبر کی دعوت دی گئی ہے۔ مثلاً: "أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ" (تو کیا لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے؟ - سورۃ محمد ۴۷:۲۴)۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ عقل کو اللہ کی آیات کی تفہیم کے لیے استعمال

کیا جانا چاہیے، مگر اسے ذاتی خواہشات کے تابع نہیں ہونا چاہیے۔ قرآن کی ایک اور آیت میں فرمایا گیا: "وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا" (اور تمہیں بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے - سورۃ الاسراء ۱۷:۸۵) اس سے پتہ چلتا ہے کہ انسانی عقل محدود ہے اور اس کی حدود کو وحی کی روشنی میں سمجھا جانا چاہیے۔

اس لیے اوپر کیے گئے سوال کے جواب میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ انبیاؑ نے اور اسلامی عروج کے ادوار میں اتنی ترقی کیوں نہیں ہوئی۔ عیسائیت یعنی اسلام نے پہلی صدی عیسوی میں یونانی تہذیب کو شکست دی اور اس کی ترقی اور فلسفہ کو زمیں بوس کر کے اس کی جگہ خالص اسلامی تعلیمات کو رائج کیا اور پورے معاشرے کو اسلامی بنا دیا۔ اسی طرح اسلام نے آخری بنی ﷺ کے ذریعے قیصر و کسریٰ، روم و ایران جیسی ترقی یافتہ اقوام کو شکست دی اور اس کی جگہ ایک سادہ اسلامی معاشرہ ترتیب دیا۔ قرآنِ مجید میں قومِ عاد اور ثمود کا تذکرہ ان قوموں کے لیے عبرت کا نشان ہے جو دنیا پرستی، طاقت کے گھمنڈ، اور نافرمانی کی راہ پر گامزن ہوتی ہیں۔ انہیں اپنی جسمانی قوت، شان و شوکت، اور مادی ترقی پر ناز تھا۔ انہوں نے پہاڑوں کو تراش کر عالیشان محلات تعمیر کیے اور اپنی طاقت پر فخر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا انکار کیا۔ ان کی سرکشی اور تکبر کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان پر عذاب نازل کیا جس نے انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔ سورۂ روم کی آیت ۴۲ میں فرمایا گیا:

"قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلُ ۚ كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُشْرِكِينَ"

ترجمہ: "کہہ دو: زمین میں سیر کرو اور دیکھو کہ پہلے لوگوں کا انجام کیسا ہوا۔ ان میں سے اکثر مشرک تھے۔"

سورۂ نمل کی آیت ۶۹ میں بھی اسی مضمون کی ترغیب دی گئی ہے:

"قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ"

ترجمہ: "کہہ دو: زمین میں سیر کرو اور دیکھو کہ مجرموں کا انجام کیسا ہوا۔"

ان واقعات سے یہ سبق ملتا ہے کہ مادی ترقی، طاقت، اور دنیاوی شان و شوکت پر ناز کرنا اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنا قوموں کی تباہی کا سبب بنتا ہے۔ یہ قصص ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ حقیقی کامیابی اور بقا اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور تقویٰ میں مضمر ہے، نہ کہ دنیاوی ترقی اور طاقت کے گھمنڈ میں۔

گیارھویں صدی میں امام غزالی نے معتزلہ اور یونانی فکر سے متاثر فلسفیوں اور سائنسدانوں (فارابی، ابو سینا وغیرہ) کو علمی شکست دے کر مسلمانوں کو سائنس اور ترقی کے الحاد سے بچایا۔ مگر سولھویں صدی کے بعد یونانی فکر کو اہل مغرب نے مسلمانوں سے حاصل کر کے اس کی نشاۃ ثانیہ کر دی اور اس کو روشن خیالی (enlightenment) سے تعبیر کر کے انسان کو آج الحاد اور گمراہی کے جنگل میں پھنسا دیا ہے۔

علمی فکر کا انکار مگر ٹیکنالوجی کی محدود قبولیت

اسلامی روایت میں "سائنس" کو ایک ایسی سوچ اور فکری طرزِ عمل کے طور پر دیکھا جاتا ہے جو وحی کی روشنی سے ہٹ کر صرف انسانی خواہشات، تجربات اور مادیت پرستی پر مبنی ہوتی ہے۔ اسلامی نظریہ کے مطابق، انسانی عقل، جذبات ایک محدود قدرت ہے جس کا اصل ماخذ اللہ تعالیٰ کی وحی ہے، اور جب عقل اور جذبات کو آزاد منطق کی شکل دی جائے تو وہ اپنی اصل حقیقت سے دور ہو جاتے ہیں۔ اس فکری دھوکے سے بچنے کے لیے اسلامی دنیا نے اپنی علمی اور روحانی ترقی کے دوران ایسے نظام کو فروغ دیا جس میں وحی اور اخلاقی اصولوں کو اولین ترجیح دی گئی، نہ کہ خالص ریشنیلیٹی کو۔ تاہم، اسلام کسی بھی ٹیکنالوجی کو مکمل طور پر رد نہیں کرتا جو انسانی ضروریات کو پورا کرے، دفاع کو مضبوط کرے یا معاشرتی فلاح و بہبود میں معاون ثابت ہو۔ تاریخی طور پر مسلمانوں نے ایسی ٹیکنالوجی کو اپنایا جو ان کے معاشرتی، فوجی اور طبی نظام کو بہتر بنانے میں مددگار رہی، جبکہ وہ اُن علوم اور فلسفوں سے دور رہے جو محض مادیت پرستی اور دنیاوی خواہشات کے فروغ کا باعث بنتے تھے۔ اس نقطۂ نظر کے تحت، اسلامی نظام میں "علم" اور "سائنس" کو ایک محدود دائرے میں رکھا گیا، جہاں اصل مقصد

انسان کو روحانی ترقی کی جانب راغب کرنا اور دنیا کو عارضی سمجھ کر آخرت کی تیاری کرنا تھا۔ مختصراً، اسلام خالص سائنس کو علمی اور فکر کے طور پر مسترد کرتا ہے کیونکہ وہ وحی کی روشنی سے قطع نظر ہو کر انسانی خواہشات اور مادیت کے تابع ہو جاتی ہے۔ مگر اس کے برعکس، وہ ٹیکنالوجی کو محدود قبولیت دیتا ہے جو انسانی ضروریات، دفاع، صحت و علاج اور معاشرتی فلاح و بہبود میں مددگار ہو۔ اس طرح اسلامی ماڈل نہ صرف روحانی بلندی کو فروغ دیتا ہے بلکہ ایک متوازن اور اخلاقی معاشرہ تشکیل دینے کی بھی کوشش کرتا ہے، جس میں دنیاوی ترقی کا مقصد صرف عارضی فوائد تک محدود رہے اور انسان اپنی اصلی شناخت یعنی اللہ کی طرف رجوع کرے اور آخرت میں کامیابی حاصل کرے۔

اسٹاک مارکیٹ پر اسلامی نقطہ نظر: تنقیدات اور شرعی متبادل

محمد یونس قادری

smyounus121@gmail.com

عالمی سرمایہ دارانہ معیشت میں اسٹاک مارکیٹ کو ایک اہم ستون سمجھا جاتا ہے، جو اقتصادی ترقی، سرمایے کی سیالیت (liquidity) اور سرمایہ کاروں کی شرکت کے لیے ایک مؤثر ذریعہ فراہم کرتی ہے۔ تاہم، شریعت کے اصولوں پر مبنی اسلامی نقطۂ نظر سے، خاص طور پر ثانوی مارکیٹ (secondary market) میں، اخلاقی اور ساختی اعتبار سے کئی سنگین مسائل پائے جاتے ہیں۔

یہ مضمون اسٹاک مارکیٹ پر اسلامی نقطۂ نظر سے کی جانے والی تنقیدات کا جائزہ لیتا ہے اور اس کے ساتھ ہی شفافیت، حقیقی شراکت داری اور حقیقی اقتصادی سرگرمی پر مبنی شریعت کے مطابق متبادل حل پیش کرتا ہے۔

اسٹاک مارکیٹ کی تفہیم: سرمایہ دارانہ مالیاتی نظام

اسٹاک مارکیٹ سرمایہ دارانہ نظام کے ساتھ ہی وجود میں آئی ہے اور اس کے بنیادی اصولوں کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ سرمائے کی نجی ملکیت، آزاد منڈی کے تصور، اور منافع کا حصول اس کے کلیدی مقاصد ہیں۔

یہ مارکیٹ ایسے تصورات کو متعارف کراتی ہے جیسے کہ بے اختیار ملکیت (disenfranchised ownership) اور کسی حقیقی مادی بنیاد کے بغیر حصص کی تجارت۔ اس مارکیٹ میں لاکھوں کی تعداد میں شیئر ہولڈرز اکثر ان کمپنیوں کے آپریشنز اور انتظامی امور سے لاتعلق رہتے ہیں جن میں انہوں نے سرمایہ کاری کی ہوتی ہے۔ ان کا اثر و

رسوخ بھی بالواسطہ نوعیت کا ہوتا ہے، یعنی وہ براہ راست کمپنی کے فیصلوں پر اثرانداز نہیں ہوتے۔

کارپوریشن اور "شخص قانونی"

کارپوریشن کو "شخص قانونی" (legal person) کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک حقیقی انسان کی طرح جائیداد کی ملکیت رکھ سکتی ہیں، معاہدوں میں داخل ہو سکتی ہیں اور قانونی طور پر مقدمہ بھی کر سکتی ہیں یا ان پر مقدمہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ تصور، جسے اکثر "کارپوریٹ پرسنالٹی" کہا جاتا ہے، انہیں ان کے مالکان (یعنی شیئر ہولڈرز) سے ایک علیحدہ اور خود مختار ہستی بنا دیتا ہے۔

اس علیحدگی کا ایک بڑا نتیجہ یہ ہے کہ کارپوریشن کی ملکیت لاکھوں شیئر ہولڈرز میں تقسیم ہوتی ہے۔ یہ پھیلی ہوئی ملکیت انتظامیہ اور حقیقی ملکیت کے درمیان ایک فاصلہ پیدا کرتی ہے۔ انتظامیہ، جو کہ پیشہ ور ایگزیکٹوز پر مشتمل ہوتی ہے، کا بنیادی ہدف شیئرز کی قدر کو زیادہ سے زیادہ کرنا اور سرمایے کی گردش کو تیز کرنا ہوتا ہے۔ اس ہدف کے حصول میں اکثر اخلاقی یا سماجی ذمہ داریوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے، یا انہیں ثانوی حیثیت دی جاتی ہے۔

اسی وجہ سے، اسلامی نقطۂ نظر سے یہ سوال اٹھتا ہے کہ آیا یہ نظام نجی ملکیت کے اصل تصور کو ختم کر کے اس کی جگہ محض "سرمایے کی ملکیت" کو فروغ دے رہا ہے؟ جہاں حقیقی فرد کی ملکیت اور اس کی ذاتی ذمہ داری کم ہو جاتی ہے اور ایک غیر شخصی (impersonal) ہستی، یعنی کارپوریشن، سرمائے پر غالب آ جاتی ہے۔

پرائمری بمقابلہ ثانوی مارکیٹس

اسٹاک مارکیٹ بنیادی طور پر ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جہاں کمپنیاں عوام کو اپنے حصص (Shares) فروخت کر کے سرمایہ (Capital) اکٹھا کرتی ہیں۔ جب کوئی کمپنی اپنے حصص بیچتی ہے، تو وہ سرمایہ کاروں سے رقم حاصل کرتی ہے جس کا استعمال وہ اپنے کاروبار کو

بڑھانے، نئی مصنوعات تیار کرنے، یا قرضوں کی ادائیگی کے لیے کر سکتی ہے۔ ان حصص کو خریدنے والے سرمایہ کار اس کمپنی کے جزوی "مالک" بن جاتے ہیں۔

اس کے بعد، یہ حصص ثانوی مارکیٹ (Secondary Market) میں خریدے اور بیچے جاتے ہیں، یعنی سرمایہ کار ایک دوسرے سے حصص خریدتے اور بیچتے ہیں۔ حصص کی قیمتیں طلب (Demand) اور رسد (Supply) کے اصول پر مبنی ہوتی ہیں: اگر زیادہ لوگ کسی حصص کو خریدنا چاہتے ہیں تو اس کی قیمت بڑھ جاتی ہے، اور اگر زیادہ لوگ اسے بیچنا چاہتے ہیں تو اس کی قیمت گر جاتی ہے۔ یہ قیمتوں کا اتار چڑھاؤ سرمایہ کاروں کو منافع کمانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

کمپنیاں ابتدائی طور پر پرائمری مارکیٹ میں فنڈز اکٹھا کرنے کے لیے ابتدائی عوامی پیشکشوں (IPOs) کا استعمال کرتی ہیں۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں کمپنی پہلی بار اپنے حصص عوام کو جاری کرتی ہے، اور اس سے حاصل ہونے والی رقم براہ راست کمپنی کے پاس جاتی ہے۔

اس کے برعکس، ثانوی مارکیٹ وہ جگہ ہے جہاں زیادہ تر اسٹاک کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ یہاں سرمایہ کار ایک دوسرے سے حصص خریدتے اور بیچتے ہیں۔ کمپنی اس مرحلے میں براہ راست شامل نہیں ہوتی اور اسے حصص کی خرید و فروخت سے کوئی اضافی فنڈز نہیں ملتے۔ ثانوی مارکیٹ قیاس آرائی (سٹہ بازی/speculation) پر مبنی ہوتی ہے اور حقیقی معیشت سے اس کا تعلق کم سے کم ہوتا چلا جاتا ہے۔

ثانوی مارکیٹ کی ناپائیداری اور مالیاتی تجرید

* قیاس آرائی، لیوریج، اور اضافہ: جب سرمایہ کار قرض فنڈز (لیوریج) کا استعمال کرتے ہوئے یا صرف مستقبل کی قیمتوں پر قیاس آرائی کی بنیاد پر ٹریڈنگ کرتے ہیں، تو یہ اثاثوں کی قیمتوں کو ان کی حقیقی قدر سے کہیں زیادہ بڑھا سکتا ہے۔ جب یہ بلبلہ پھٹتا ہے یا اعتماد ختم ہوتا ہے تو اس کے نتیجے میں شدید مندی (Crash) آسکتی ہے۔

* غیر اقتصادی عوامل اور مالیاتی سرایت: مارکیٹس صرف اقتصادی بنیادوں پر نہیں چلتی

ہیں۔ جغرافیائی سیاسی خبریں، افواہیں، اور سرمایہ کاروں کے جذبات قیمتوں پر گہرا اثر ڈال سکتے ہیں، چاہے ان کا حقیقی معیشت سے براہ راست تعلق نہ ہو۔ یہ مارکیٹ کو مزید غیر متوقع بنا دیتا ہے۔

* بحران کی حرکیات اور نظامی خطرہ: چونکہ مارکیٹس باہم مربوط (Interconnected) ہوتی ہیں، ایک چھوٹے واقعے سے بھی ایک سلسلہ وار ردعمل شروع ہو سکتا ہے جو بڑے پیمانے پر نظامی بحران (Systemic Crisis) کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔ ۲۰۰۸ کا مالیاتی بحران اس کی ایک واضح مثال ہے۔

* پیداوار سے پہلے قدر کی تجارت: مالیاتی تجرید کا عروج:

* کموڈیٹی فیوچرز: اصل میں ہیجنگ (Hedging) یعنی خطرے کو کم کرنے کے لیے بنائے گئے یہ معاہدے اب بڑے پیمانے پر قیاس آرائی کے لیے استعمال ہو رہے ہیں، جہاں اشیاء کی مستقبل کی قیمتوں پر شرطیں لگائی جاتی ہیں، بجائے اس کے کہ ان کی حقیقی پیداوار یا استعمال ہو۔

* ڈیریویٹیوز: فیوچرز، فارورڈز، اور آپشنز جیسے آلات اسٹاک مارکیٹوں میں خریدے اور بیچے جاتے ہیں اور اپنی قدر دیگر بنیادی اثاثوں (جیسے اسٹاکس، بانڈز، کموڈیٹیز) سے حاصل کرتے ہیں۔ یہ حقیقی اقتصادی سرگرمی سے منقطع (Disconnected) ہوتے ہیں، جس سے مالیاتی نظام میں پیچیدگی اور خطرہ بڑھ جاتا ہے۔

اسٹاک مارکیٹ پر اسلامی تنقید

* نجی ملکیت کا خاتمہ: اسلام میں ملکیت صرف ایک قانونی حق نہیں بلکہ اس کے ساتھ ذمہ داریاں ہوتی ہیں اور اثاثے کے بارے میں مکمل معلومات کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ جدید اسٹاک مارکیٹ میں شیئر ہولڈرز کی گمنامی (Anonymity) اور کمپنی کے روزمرہ کے معاملات سے لاتعلقی (Detachment) اس تصور سے مطابقت نہیں رکھتی۔ اسلامی نقطۂ نظر سے، حقیقی ملکیت میں اثاثے پر کنٹرول اور اس سے جڑے خطرات و ذمہ داریوں کا براہ

راست تعلق ہونا چاہیے۔

*غرر (غیر یقینی صورتحال یا دھوکہ دہی) کی موجودگی: قیاس آرائی پر مبنی آلات (Speculative Instruments) جیسے کہ ڈیریویٹیوز (derivates) میں اکثر بہت زیادہ غیر یقینی صورتحال (Uncertainty) اور مبہم شرائط شامل ہوتی ہیں۔ اسلامی معاہدات میں شفافیت، وضاحت اور ہر فریق کے حقوق و فرائض کا واضح ہونا ضروری ہے۔ غرر کی موجودگی معاہدے کو باطل قرار دے سکتی ہے، کیونکہ یہ دھوکہ دہی یا غیر منصفانہ نقصان کا باعث بن سکتی ہے۔

*قیاس آرائی اور میسر (جوا): اگر کسی لین دین کا مقصد صرف قیمتوں کے اتار چڑھاؤ سے بغیر کسی حقیقی معاشی سرگرمی، محنت یا اثاثے کی پیداوار کے منافع کمانا ہو، تو اسے جوا (gambling) سمجھا جاتا ہے۔ اسلام میں جوا سختی سے ممنوع ہے، اور اسٹاک مارکیٹ میں خاص طور پر قلیل مدتی اور لیوریجڈ ٹریڈنگ (leveraged trading) اکثر اس تعریف کے دائرے میں آتی ہے۔

*سود پر مبنی لین دین (ربا): اسلامی مالیات میں سود (usury) کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ جدید اسٹاک مارکیٹ میں مارجن ٹریڈنگ (Margin Trading) اور دیگر قرض پر مبنی آلات میں سود کی ادائیگی شامل ہوتی ہے، جو براہ راست شریعت کی خلاف ورزی ہے۔ اسلامی مالیاتی اصولوں میں سرمائے پر منافع صرف حقیقی معاشی سرگرمی اور خطرے کے اشتراک کے نتیجے میں حاصل ہونا چاہیے۔

*اثاثے کی عدم ملکیت: اسلامی قانون کے تحت، کسی ایسی چیز کو فروخت کرنا جو آپ کی ملکیت میں نہ ہو، غرر پیدا کرتا ہے اور ممنوع ہے۔ اسٹاک مارکیٹ میں، خاص طور پر مختصر فروخت (short selling) جیسی ٹریڈنگ میں، سرمایہ کار اکثر ایسے اثاثے بیچتے ہیں جو ان کی ملکیت میں نہیں ہوتے، اور امید کرتے ہیں کہ بعد میں انہیں کم قیمت پر خرید کر منافع کمایا جا سکے۔ یہ اسلامی مالیاتی اصول کے خلاف ہے۔

*سماجی ذمہ داری کی نظر اندازی: اسلامی مالیات کا ایک اہم ستون یہ ہے کہ مالی سرگرمیاں صرف ذاتی منافع کے لیے نہیں بلکہ کمیونٹی کی فلاح و بہبود اور سماجی ذمہ داریوں کو بھی پورا کریں۔ جدید اسٹاک مارکیٹس کا بنیادی محرک اکثر صرف منافع کو زیادہ سے زیادہ کرنا (Profit Maximization) ہوتا ہے، جو سماجی و اخلاقی اقدار کو نظر انداز کر سکتا ہے۔ اسلامی معاش کا بنیادی مقصد معادنہ کہ دنیاو دنیوی منافعے ہیں۔

موجودہ منظر نامے میں اسٹاک مارکیٹ کی عدم ضرورت: اسلامی نقطۂ نظر

اسلامی مالیات کے اصول، بالخصوص ان کے ساختی تضادات کی وجہ سے، جدید اسٹاک مارکیٹ کی کی ضرورت پر سوال اٹھاتے ہیں۔ اسلام ایک ایسے مالیاتی نظام کو فروغ دیتا ہے جو شراکت داری (Partnership)، خطرے کی تقسیم (Risk Sharing)، اور حقیقی معاشی سرگرمی (Real Economic Activity) پر مبنی ہو۔

مندرجہ ذیل دو اہم تمویلی آلات مندرجہ بالا اسلامی معاشی فلسفے کی عملی شکلیں ہیں:

*مضاربہ (Mudarabah): یہ ایک ایسا معاہدہ ہے جہاں ایک فریق (رب المال) سرمایہ فراہم کرتا ہے، اور دوسرا فریق (مضارب) اس سرمائے کو استعمال کرتے ہوئے کاروبار چلاتا ہے۔ منافع کو پہلے سے طے شدہ تناسب سے تقسیم کیا جاتا ہے (منافع کی تقسیم حقیقی نفع کے تناسب سے طے کی جانی ضروری ہے)، جبکہ نقصان کی صورت میں اصول یہ ہے کہ اگر نقصان ہو جائے تو اس نقصان کو اولاً نفع سے پورا کیا جاتا ہے اگر نقصان نفع سے پورا ہو جائے تو فبہا ورنہ اس نقصان کی ذمہ داری رب المال (انویسٹر) پر عائد ہوتی ہے الا یہ کہ مضارب کی بد انتظامی یا کوتاہی ثابت ہو۔ مضاربت میں اعتماد (Trust) اور کاروبار کی براہ راست معلومات (Direct Knowledge) کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔

* مشارکہ (Musharakah): یہ ایک مشترکہ منصوبہ ہے جہاں تمام فریق سرمایہ فراہم کرتے ہیں اور منافع اور نقصان دونوں میں اپنے حصص کے تناسب سے شریک ہوتے ہیں۔ یہ ایک ایسی شراکت داری ہے جس میں تمام شراکت دار فعال طور پر کاروبار کے فیصلوں میں

حصہ لے سکتے ہیں اور خطرے کو مشترکہ طور پر برداشت کرتے ہیں۔

یہ تمویلی آلات اعتماد، کاروبار کی براہ راست معلومات، اور اخلاقی ذمہ داری پر مبنی ہوتے ہیں۔ ان میں عام طور پر ۱۰-۲۰ شراکت دار شامل ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کو جانتے ہیں، جس سے:

* اخلاقی سرمایہ کاری (Ethical Investment Practices) کو برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ شراکت دار ایک دوسرے کو اور کاروبار کو جانتے ہیں، جس سے غیر اخلاقی یا غیر شرعی سرگرمیوں کا امکان کم ہوتا ہے۔

* قیاس آرائی پر مبنی ٹریڈنگ (Speculative Trading) کا خاتمہ ہوتا ہے۔ چونکہ سرمایہ کاری حقیقی اثاثوں اور کاروباروں میں ہوتی ہے اور اس کا مقصد حقیقی پیداوار اور خدمات سے منافع کمانا ہوتا ہے، نہ کہ صرف قیمتوں کے اتار چڑھاؤ سے، اس سے قیاس آرائی کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے، یہ شراکت داری کے ماڈل معاشرتی ہم آہنگی اور مالیاتی استحکام کو فروغ دیتے ہیں، کیونکہ یہ خطرے کو تقسیم کرتے ہیں اور افراد کو حقیقی معیشت کے ساتھ جوڑتے ہیں، بجائے اس کے کہ انہیں محض مالیاتی قیاس آرائیوں میں دھکیل دیا جائے۔

بہتر متبادل: اخلاقی، مقامی سرمایہ کاری

اسلام ایسے سرمایہ کاری کے طریقوں کی حمایت کرتا ہے جو جدید اسٹاک مارکیٹ کے قیاس آرائی پر مبنی پہلوؤں سے پاک ہوں۔ اسلامی مالیاتی نظام ایسے سرمایہ کاری کو ترجیح دیتا ہے جو:

* حقیقی اثاثوں پر مبنی ہوں: سرمایہ کاری کا تعلق ٹھوس، حقیقی اثاثوں، پیداوار اور خدمات سے ہونا چاہیے نہ کہ محض کاغذی اقدار یا مالیاتی آلات سے جو حقیقی معیشت سے کٹے ہوئے ہوں۔

* شفافیت کے تحت ہوں: تمام مالی لین دین میں مکمل شفافیت (Transparency) ضروری ہے۔ ہر فریق کو لین دین کی نوعیت، خطرات اور متوقع منافع کے بارے میں مکمل اور واضح معلومات ہونی چاہیے۔ یہ غرر (غیر یقینی صورتحال) کے خاتمے کے لیے ناگزیر ہے۔

* باہمی رضامندی اور مشترکہ خطرے پر مبنی ہوں: تمام شرکاء کی باہمی رضامندی (Mutual Consent) سے فیصلے ہونے چاہییں، اور نفع و نقصان دونوں میں مشترکہ خطرے (Shared Risk) کا اصول لاگو ہونا چاہیے۔ یہ سرمایہ کاری میں ذمہ داری اور انصاف کو فروغ دیتا ہے۔

* حقیقی انسانی ملکیت ہو جو کہ ہر معاملے کے لیے جوابدہ ہوں: سرمایہ کاری میں شامل افراد کی حقیقی ملکیت اور جوابدہی (Accountability) ہونی چاہیے۔ جو افراد سرمایہ کاری کرتے ہیں، ان کا کاروبار اور اس کے نتائج سے براہ راست تعلق ہونا چاہیے، نہ کہ صرف گمنام شیئر ہولڈرز کی طرح جو صرف منافع کے پیچھے ہوں۔

ایسے ماڈلز میں:

* حصص کی خرید و فروخت کسی بھی پیمانے پر نہیں ہوتی: اس کا مطلب ہے کہ شیئرز کا بڑے پیمانے پر سٹاک مارکیٹ میں قیاس آرائی کے لیے خرید و فروخت نہیں ہوتی، جو کہ قیاس آرائی کو ختم کرتا ہے۔

* شیئر کی ملکیت آسانی سے تبدیل نہیں ہو سکتی: ملکیت کا تعلق کمپنی کے حقیقی آپریشنز اور اس میں شامل افراد سے گہرا ہوتا ہے۔

* اگر کوئی شریک باہر نکلنا چاہے تو کمپنی اندرونی طور پر تصفیے کی سہولت فراہم کرتی ہے: یہ نظام دیانت (Integrity) اور اعتماد (Trust) کو برقرار رکھتا ہے کیونکہ لین دین براہ راست اور باہمی رضامندی پر مبنی ہوتا ہے، بجائے اس کے کہ اسے کسی غیر مربوط ثانوی مارکیٹ میں فروخت کیا جائے۔ یہ مقامی کمیونٹی کے تعلقات اور کاروباری اخلاقیات کو ترجیح دیتا ہے۔ یہ اصول دراصل اسلامی مالیاتی نظام کی روح ہیں جو معاد پر مبنی حقیقی معیشت، عدل و انصاف (یعنی شریعت مطہرہ)، اور اخلاقی اقدار کو مالی سرگرمیوں کا لازمی حصہ بناتے ہیں۔

موجودہ دور میں عملی پذیری: تمویلی اداروں کا کردار

اسلامی مالیاتی نظام صرف نظریاتی نہیں ہے بلکہ اسے موجودہ معاشی منظر نامے میں کامیابی کے

ساتھ لاگو کیا جا سکتا ہے، خاص طور پر تمویلی اداروں کے ذریعے جو اسلامی اصولوں پر کام کریں۔ یہ ادارے فنڈز کی فراہمی اور اقتصادی ترقی میں کلیدی کردار ادا کر سکتے ہیں:

* فنڈ کی روانی اور اقتصادی ترقی: بڑے پیمانے پر اقتصادی منصوبوں کے لیے یقیناً بڑے سرمایے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے، اس ضرورت کو اسلامی تمویلی اداروں کے مربوط قیام کے ذریعے جن کے مراکز مساجد و مدارس و خانقاہیں ہوں اور جو علماء اور اسلامی جماعتوں کی نگرانی میں کام کریں پورا کیا جا سکتا ہے۔ یہ ادارے مضاربہ اور مشارکہ جیسے شرعی اصولوں کے تحت مختلف مذہبی صاحب دولت افراد سے فنڈز اکٹھا کر سکتے ہیں۔ اس طرح، وہ شریعت کی تعمیل کو برقرار رکھتے ہوئے مالی اعانت فراہم کر سکتے ہیں، جو کہ روایتی اسٹاک مارکیٹ کے سود اور قیاس آرائی پر مبنی طریقوں سے مختلف ہے۔

* لیکویڈیٹی اور سرمایہ کاری کی لچک: اسلامی تمویلی ادارے اخلاقی لیکویڈیٹی (Ethical Liquidity) کو یقینی بنانے کے لیے ساختی اخراج کے طریقے (structured exit mechanisms) تیار کر سکتے ہیں۔ اس میں مندرجہ ذیل طریقے شامل ہو سکتے ہیں

* منافع کی تقسیم: سرمایہ کاروں کو باقاعدہ بنیادوں پر منافع کی تقسیم کے ذریعے لیکویڈیٹی فراہم کی جائے۔

* موجودہ یا منظور شدہ شرکاء کو پہلے سے طے شدہ شیئرز کی فروخت: اگر کوئی شریک منصوبے سے باہر نکلنا چاہے، تو اس کے شیئرز کو پہلے سے طے شدہ شرائط پر دیگر موجودہ شرکاء یا ادارے کے منظور شدہ نئے شرکاء کو فروخت کیا جا سکتا ہے۔ یہ نظام قیاس آرائی کے بغیر لیکویڈیٹی فراہم کرتا ہے اور حقیقی کاروباری شراکت داری کے اصولوں پر مبنی ہوتا ہے۔

* خطرے کا تنوع: روایتی مارکیٹوں میں اکثر نامعلوم تنوع پر انحصار کیا جاتا ہے، جہاں سرمایہ کار مختلف شعبوں میں صرف اس لیے سرمایہ لگاتے ہیں کہ خطرہ کم ہو، بسا اوقات بغیر حقیقی تحقیق کے۔ اس کے برعکس، اسلامی تمویلی ادارے حقیقی منصوبوں اور منافع / نقصان کی شراکت کے ماڈلز پر مبنی ہوتے ہیں۔ یہ ماڈل خطرے کو حقیقی معاشی سرگرمی اور ٹھوس اثاثوں

کی بنیاد پر تقسیم کرتے ہیں، جس سے سرمایہ کاری زیادہ مستحکم اور شفاف ہوتی ہے۔ اس میں خطرے کا تعین حقیقی کاروبار کی کارکردگی پر ہوتا ہے نہ کہ محض مارکیٹ کے اتار چڑھاؤ پر۔ یہ نکات ظاہر کرتے ہیں کہ اسلامی مالیات نہ صرف نظریاتی طور پر مضبوط ہے بلکہ وہ عملی طور پر بھی پائیدار ہو سکتی ہے۔

نتیجہ

مندرجہ بالا بحث کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

* اسٹاک مارکیٹ کا بنیادی مسئلہ: جدید اسٹاک مارکیٹ، خاص طور پر اس کی قیاس آرائی پر مبنی ثانوی مارکیٹ، اسلامی معیشت کی بنیادی اقدار سے متصادم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حقیقت پر مبنی معیشت کے بجائے مالی تجرید کو، پیداوار کے بجائے قیاس آرائی کو، اور اخلاقیات کے بجائے صرف منافع کو ترجیح دیتی ہے۔ یہ اسلامی مالیاتی اصولوں، جیسے کہ غرر، میسر، اور ربا سے اس کے تصادم کو واضح کرتا ہے۔

* اسلامی معاشروں کے لیے راستہ: اسلامی معاشروں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ مغربی سرمایہ دارانہ نظام کی اندھی تقلید کرنے کے بجائے ایسے مالیاتی نظام تشکیل دیں جو اعتماد، شفافیت اور حقیقی معاشی سرگرمیوں پر مبنی ہوں۔ یہ نہ صرف شرعی ضرورت ہے بلکہ ایک مستحکم اور پائیدار معیشت کے لیے بھی ناگزیر ہے۔

*اسلامی متبادل: ہم نے جو متبادل پیش کیے ہیں، جیسے کہ مضاربہ، مشارکہ، اور تمویلی ادارے، وہ شریعت کے مطابق ایسے مضبوط اور اخلاقی فریم ورک فراہم کرتے ہیں جو اسلامی مالیات کے روحانی اور معاشی دونوں پہلوؤں کو پورا کرتے ہیں۔ یہ حقیقی شراکت داری، خطرے کی تقسیم، اور سماجی ذمہ داری پر زور دیتے ہیں۔

* مستقبل کی راہ: ہم نے آخر میں یہ بھی واضح کیا کہ اس راستے پر چلنا نہ صرف ایک دینی فریضہ ہے بلکہ ایک پائیدار، منصفانہ، اور مضبوط معاشی مستقبل کے لیے بھی ضروری ہے۔ یہ اسلامی مالیاتی نظام کے وسیع تر سماجی اور اقتصادی فوائد کو اجاگر کرتا ہے۔

نظم اجتماعی (پبلک آرڈر) میں عورتوں کی شمولیت

افغانستان اقتصادی مشاورتی گروپ

اسلامی امارت افغانستان نے عورتوں کے حقوق کی جو تشریح کی ہے اس کی حکمت اسلامی حلقوں میں بھی واضح نہیں۔ بالخصوص خواتین کی اعلیٰ تعلیم کے حصول کے ضمن میں جو پابندیاں لگائی گئی ہیں ان کے بارے میں اسلامی حلقوں میں بھی شکوک کا اظہار کیا جارہا ہے۔ اس رویے کو اختیار کرنے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نجی زندگی (پرائیویٹ لائف) اور نظم اجتماعی (پبلک آرڈر) کے تعلق کو دورِ حاضر کے تناظر میں پوری طرح نہیں سمجھے ہیں۔

اس مضمون کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصے میں نجی زندگی اور نظم اجتماعی کے اسلامی تصور کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ پھر نجی زندگی اور نظم اجتماعی کی سرمایہ دارانہ تشکیل زیر بحث لائی جائے گی اور آخر میں اس ضمن میں سامراجی تخریب کاری اور دراندازی کی اجمالی تشریح پیش کی جائے گی۔

نجی زندگی اور نظم اجتماعی

امارتِ اسلامی نے عورتوں کے حقوق کی جو تشریح حضرت امیر المومنین کے جاری کردہ فرمان (مجریہ ۲۰۲۲) کے مطابق کی ہے وہ شرع مطہرہ اور ہماری چودہ سو سالہ تاریخ سے مطابقت رکھتی ہے۔ اس چودہ سو سالہ تاریخ میں کبھی بھی عورتوں کو نظم اجتماعی کے دائرہ میں شامل نہیں کیا گیا۔ نہ ان کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام کیا گیا نہ ان کو عدلیہ، انتظامیہ اور افواج میں ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ نہ ثقافتی میدانوں میں وہ منظر عام پر لائی گئیں۔ عورتوں کو نظم اجتماعی میں شامل کرنا لازماً تاریخ اسلامی کے اصل اور مرکزی دھارے سے انحراف ہے۔ اسلام عورتوں کا دائرۂ کار نجی زندگی تک محدود کرتا ہے اور ان کو نظم اجتماعی (حصولِ رزق، عدل کی فراہمی، جہاد وغیرہ) کی ذمہ داریاں نہیں سونپتا۔ نجی زندگی اسلامی روحانیت اور اخلاقیات کی تعمیر اور فروغ کا اصل دائرہ ہے اور پرورشِ اطفال اور خانگی تحکم کے ذریعہ عورتیں اسلامی کردار اور شخصیت کی اصل معمار ہوتی ہیں۔ وہ گھر کی ملکہ ہوتی ہیں اور عفت و پاکیزگی ان کی بنیادی صفات ہوتی ہیں۔ اسلامی گھرانے اسلامی تہذیبی مراکز ہوتے ہیں جہاں اسلامی ثقافت

اور فنون فروغ پاتے ہیں۔ نسوانیت کے اصل اظہار (بے غرضی، خلوص، محبت، اخلاص) کا فطری دائرۂ اظہار نجی زندگی ہی ہے۔

نظم اجتماعی کی ذمہ داریاں اگر عورتوں کو سونپی جائیں تو نسوانیت تباہ ہو جاتی ہے اور نسوانیت کی تباہی اور اسلامی معاشرت کا انہدام ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ اخلاص، محبت، بے غرضی اور ایثار کے فطری سوتے سوکھ جاتے ہیں۔ عفت و عصمت لایعنی تصورات بن جاتے ہیں۔ اطفال کی تربیت سازی کا عمل اور بزرگوں کی خدمت کا عمل معدوم ہوتا چلا جاتا ہے۔ نجی زندگی کا دائرہ سکڑ کر نظم اجتماعی کا ذیلی شعبہ بن جاتا ہے۔ خاندان بالخصوص قبائلی نظاماتی خاندان تباہ ہو جاتے ہیں۔ عورتوں کو نظم اجتماعی کی ذمہ داریوں سے بری رکھنا ان کی نسوانیت اور نجی زندگی کے دائرۂ کار کے تحفظ کے لیے لازمی ہے۔

اس بات کا احساس صرف ہمیں نہیں عیسائیوں اور یہودیوں کو بھی تھا۔ انہوں نے بھی اٹھارھویں صدی تک عورتوں کو نظم اجتماعی کے دائرۂ کار سے باہر رکھا۔ ان کے ہاں بھی خاندانی نظام کو تحفظ فراہم کیا گیا تھا۔ ان کے ہاں بھی عفت و عصمت قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی۔ ان کے ہاں بھی پرورشِ اطفال اور خدمتِ بزرگاں عورتوں کی بنیادی ذمہ داری تصور کی جاتی تھی۔ ان کے ہاں بھی عورتوں کی اعلیٰ تعلیم کی فراہمی اور عورتوں کو انتظامی ذمہ داریاں سونپنے کا کوئی رواج نہ تھا۔ عورتوں کی ذمہ داریوں کو نجی دائرۂ کار تک محدود رکھنا ابراہیمی مذاہب کی مشترکہ روایت ہے۔

سرمایہ دارانہ نسوانیت کشی

سرمایہ داری کا نسوانیت پر حملہ اس کی عیسائیت دشمنی کا ایک جزو ہے۔ سرمایہ حرص و ہوس کی تجسیم ہے جو دولت اور محنت پر قبضہ کر کے معاشرت کو پراگندہ کرتا رہتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں نجی زندگی اور نظم اجتماعی میں تقسیم مبہم ہوتی چلی جاتی ہے۔ سرمایہ صرف ریاست اور مارکیٹ پر قبضہ نہیں کرتا اس کا اصل ہدف حرص اور ہوس سے مغلوب سرمایہ دارانہ انفرادیت کی پرورش ہوتی ہے۔

سرمایہ کا تحکم نجی زندگی پر مسلط کرنے کے لیے نسوانیت کی تباہی ضروری ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں نسوانیت کو دو طریقوں سے برباد کیا جاتا ہے۔ ایک طرف عورتوں کی ملازمت کو

فروغ دے کر ان کو سرمایہ کے گردشی چکر کا اسیر بنایا جاتا ہے۔ ان پر حصولِ معاش کی ذمہ داری سونپی جاتی ہے۔ وہ سرمایہ کی غلام بنادی جاتی ہیں اور یوں ان میں خود غرضی، لالچ اور حسد کی پرورش کر کے ان کی فطری بے غرضی اور ایثار کی صفات کو کچلا جاتا ہے۔ اس عمل نے پہلی جنگ عظیم کے بعد سے زور پکڑا اور اب یورپ اور امریکا کی ہر عورت اپنی نسوانیت کو ترک کر کے سرمایہ کی غلام بن گئی ہے اور یہ عمل بھارت اور چین میں بھی پورے زور و شور سے جاری ہے۔ دوسری طرف عورت کے جسم کی سرمایہ کاری کا فروغ جاری ہے۔

اشتہارات کی صنعت، تفریحی صنعتیں اور میڈیا عورت کے جسم کی فروخت کے ذریعے نسوانیت کو تباہ کر رہے ہیں۔ اس کے نتیجے میں معاشرہ فحاشی کے سیلاب میں ڈوبتا چلا جارہا ہے۔ زنا ایک وبا کی طرح پھیل رہا ہے۔ خاندانی نظام برباد ہو گیا ہے۔ نفسیاتی اور جنسی امراض پھیل رہے ہیں۔ پوپ فرانسس اغلام بازوں کا وکیل بن گیا ہے۔ شرح افزائش آبادی منفی ہو رہی ہے اور اقوام متحدہ زن بالرضا کو ہیومن رائٹ قرار دے رہی ہے۔ بے غیرت عیسائی، یہودی اور مسلمان یہ سب برداشت کر رہے ہیں اور ردِ نسوانیت کی اس مہم کو مسلم دنیا میں پھیلانے کی راہ ہموار کرنے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔

مشرق میں ہے تقلید فرنگی کا جہاد

ردِ نسوانیت کی سامراجی مہم

ہم امارت اسلامیہ افغانستان میں ایک غیر سرمایہ دارانہ معیشت اور معاشرت قائم کرنے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ اس جدوجہد میں نسوانیت کا تحفظ لازم ہے کیونکہ یہ کیے بغیر قومی معاشرت کو غیر سرمایہ دارانہ اور اسلامی خطوط پر استوار نہیں کیا جا سکتا اور ہم اسلامی امارتی نظام کو تاریخ اسلامی کا تسلسل نہیں بنا سکتے۔ آج سامراج (اقوام متحدہ، ورلڈ بینک اور نیٹو سے منسلک ہیومینٹرین گروپ) افغانستان میں تردید نسوانیت کی تحریک کو فروغ دینے کی بھرپور مہم چلائے ہوئے ہیں۔ وہ عورتوں پر نظم اجتماعی کی ذمہ داریاں تھوپنے کی وکالت کر رہے ہیں۔ وہ ہم سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ عورتوں کے سرمایہ دارانہ حقوق بحال کیے جائیں۔ عورتوں کی سرمایہ دارانہ غلامی کو فروغ دیا جائے۔ حجاب اور سفر میں محرم کی شمولیت کے احکامات منسوخ کیے جائیں اور عورتوں کی اعلیٰ تعلیم میں شمولیت کو بحال کیا جائے۔ (جب کہ

مروجہ نظام تعلیم میں نسوانیت کی صفات کے فروغ کا کوئی تصور موجود نہیں اور ہماری تاریخ میں یہ بالکل اجنبی تصور ہے)۔

اس سامراجی مہم کا مقصد عورتوں کو قبائلی خاندانی نظام کے تحفظ سے محروم کرنا ہے اور افغان معاشرت کو سرمایہ دارانہ خطوط پر مرتب کرنا ہے تاکہ اسلامی اقدار کی معاشرتی بنیادیں کمزور ہوں اور سرمایہ دارانہ عمل نجی زندگی کے دائرے کو اپنے اندر سمو لے۔ عورتیں اپنی نسوانیت کھوتی چلی جائیں۔ وہ سرمایہ دارانہ گردشی چکر میں گرفتار ہوں۔ حرص اور ہوس کا معاشرتی پھیلاؤ ہو۔ افغان اسلامی شعور اور ثقافتی نظام تباہ ہو۔ فحاشی اور بدکاری عام ہو۔ افغانستان عالمی سرمایہ دارانہ معاشی اور معاشرتی نظام میں ضم ہوتا چلا جائے۔ اور اسلامی حکومت (جس کو سامراج کے تمام نمایندہ ادارے وقتی کہتے ہیں) بالآخر ختم ہو جائے اور سرمایہ دارانہ دہریہ سامراج کے غلام دوبارہ ریاستی اقتدار سنبھالیں۔

ہمیں سامراجی مطالبات کو مطلقاً مسترد کر دینا چاہیے کیونکہ اس قسم کے مطالبات کے جزوی اجراء کے ہولناک نتائج ہم اسلامی جمہوریہ ایران میں دیکھ رہے ہیں جہاں لبرل اور قوم پرست قوتوں کے دباؤ کے نتیجے میں اسلامی حکومت نے خواتین کے سرمایہ دارانہ حقوق تعلیم اور ملازمت اور مواصلت کے ضمن میں قبول کر لیے۔ اس کے نتیجے میں تحریک ردِ نسوانیت یعنی فیمی نزم آج ایران میں سب سے طاقت ور اسلام مخالف رجحان کے طور پر منظم ہے اور معاشرہ میں فحاشی اور زناکاری (متعہ کے پردے میں) عام ہو رہی ہے۔ ایرانی ادب اور ثقافت میں بھی اشتراکی اور انارکسٹ رجحانات عام ہیں۔

ہم اسلامی انقلابی ہیں۔ ہم سرمایہ داری سے مفاہمت یا سرمایہ دارانہ نظام کی اصلاح نہیں چاہتے۔ ہم اس کے انہدام کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ تحفظ نسوانیت یعنی نسوانیت کو سرمایہ دارانہ نظم اجتماعی میں انضمام سے محفوظ رکھنا ہمارا فرض ہے۔ سامراج کی تمام تر ریشہ دوانیوں کے باوجود ہم اس فرض کو ادا کرتے رہیں گے۔

Da Afghan Iqtisadi Mushawarti Group

جماعت اسلامی اعانت جہاد فلسطین میں کیا کر سکتی ہے؟

محترم امیر جماعت کی خدمت میں چند تجاویز

امین اشعر، جاوید شیخ
Islami.inqilaab@gmail.com

نوٹ: یہ مضمون غزہ پر اسرائیلی حملے کے ابتدائی دنوں میں لکھا گیا تھا لیکن اس کی دیرپا اہمیت کی بنیاد پر ہم اسے جوں کا توں شائع کر رہے ہیں۔

ماشاءاللہ ہماری جماعت اعانت جہاد فلسطین کے لیے ملکی مہم میں ایک قائدانہ کردار ادا کر رہی ہے جس سے اس کا اسلامی انقلابی تشخص عیاں ہوتا ہے۔ اس جہادی اعانت کو موثر بنانے کے لیے ہمیں نسبتاً طویل المدت حکمت عملی مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ حکمت عملی اس جہاد کی نوعیت کا اندازہ لگانے پر منحصر ہونی چاہیے۔ جہاد کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ حماس کی قیادت سے دیرپا روابط قائم کیے جائیں تاکہ ان کی حکمت عملی کے ادراک کی بنیاد پر اپنی اعانتی مہمات ترتیب دی جا سکیں۔ ہمیں حماس کے اقدام کے اہداف کا علم نہیں لہٰذا جو معروضات آپ کی خدمت میں ہم پیش کریں گے وہ لازماً قیاسی ہیں اور معروضی تصورات پر مبنی ہیں اور ان کے درست ہونے کا احتمال مشکوک ہے۔ پھر بھی اپنی حکمت عملی مرتب کرنے کے لیے ایک تناظراتی خاکہ مرتب کرنا ناگزیر ہے۔

جہاد کی مفروضہ نوعیت

مقبوضہ فلسطین میں فلسطینیوں کی آبادی تقریباً سات ملین ہے جو تین حصوں میں منقسم ہے۔ مقبوضہ اسرائیل، مقبوضہ مغربی ساحل اور غزہ۔ غزہ کی آبادی ایک ملین سے کچھ زیادہ ہے اور حماس کا سیاسی غلبہ غزہ تک محدود ہے۔ مغربی ساحلی مقبوضہ علاقے میں بھی اس کا اثر و رسوخ موجود ہے جو جہاد کی وجہ سے بڑھ رہا ہے۔ مقبوضہ اسرائیل میں حماس کا کوئی وجود

نہیں۔ دشمن کا ہدف اصلاً حماس اور فلسطینیوں میں پھیلتا ہوا اسلامی شعور ہے۔ دشمن کا اولین مقصد حماس کو کچل دینا ہے۔ اس کے لیے وہ غزہ پر قبضہ کر کے ایک پٹھو فلسطینی سرکار وہاں قائم کرنا چاہتا ہے (جیسا کہ اس نے اوسلو معاہدات کے تناظر میں مغربی ساحل میں کیا)۔ امکان یہی ہے کہ دشمن اس ہدف کے حصول میں کم از کم وقتی طور پر کامیاب ہو جائے گا اور حماس کو ویسی ہی پسپائی قبول کرنا پڑے گی جیسی پسپائی افغانستان میں طالبان نے ۲۰۲۲ میں قبول کی تھی۔

انشاء اللہ دشمن کی یہ کامیابی دیرپا ثابت نہ ہو گی اور حماس طالبان اور جنوبی افریقہ کی اے این سی اور کولمبیائی ایف اے آر سی کی طرح ایک مضبوط زیر زمین گوریلا تحریک میں تبدیل ہو جائے گی جس کا اثر اور کنٹرول مقبوضہ فلسطین، مقبوضہ اسرائیل، مقبوضہ مغربی ساحل اور غزہ میں بتدریج بڑھتا چلا جائے گا اور اسرائیلی غاصب سیاسی نظام مجروح ہوتا چلا جائے گا۔ یہ عمل لازماً طویل المدت ہے۔ جنوبی افریقہ میں اس کو تقریباً ۷۵ سال لگے۔ افغانستان میں ۵۰ سال، کولمبیا میں یہ ۱۹۵۰ کی دہائی سے آج تک جاری ہے۔ اس جہاد کی ممکنہ طویل المدتی نوعیت کو نیتن یاہو جانتا ہے اور اس نے اس کا اقرار بھی کیا ہے۔

ہمارا اندازہ ہے کہ دشمن سیز فائر کی کسی تجویز پر اس وقت تک راضی نہیں ہو گا جب تک وہ حماس کے اقتدار کو ختم نہ کر دے اور ہمارا اندازہ یہ بھی ہے کہ اسرائیلی افواج کو غزہ سے فی الحال نکال دینے کی استطاعت حماس نہیں رکھتی۔ جہاد کا یہ دورانیہ سقوط غزہ پر ہی منتج ہو گا۔ گو کہ غزہ کی تسخیر کی بہت بڑی جانی اور مالی قیمت حماس اسرائیل پر مسلط کر سکتی ہے اور کرنا چاہیے۔ غزہ پر قبضہ کی جتنی بڑی قیمت اسرائیل کو برداشت کرنا پڑے گی اتنا زیادہ اس کا تمام مقبوضہ فلسطین پر اقتداری نظام متزلزل ہو گا۔

اعانت جہاد فلسطین میں جماعت اسلامی پاکستان کا کردار

سب سے پہلی ضرورت اس بات کی ہے کہ حماس سے مکالمے کی بنیاد پر اس منظر نامہ کی درستگی یا غیر درستگی کو جانچا جائے۔ سوال یہ ہے کہ کیا حماس طالبان، اے این سی اور ایف اے آر

سی کی طرح ایک طویل المدت زیر زمین جدوجہد کے لیے آمادہ ہے۔ یا اس کی جہادی پیش رفت کے مقاصد کچھ اور ہیں۔ حماس کے جو بھی مقاصد ہوں ہمیں اپنی استطاعت کے مطابق اس کی ہر ممکنہ مدد کرنی چاہیے۔

پاکستان سے اعانت کے کئی طریقے موثر ہوسکتے ہیں۔ ایک مالی امداد جس میں الحمدللہ ہم نے اپنا حصہ ڈالنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اگر ہمارا اندازہ درست ہے کہ یہ طویل المدت جہاد ہو گا تو ضرورت یہ ہے کہ یہ امداد جہاد کے پورے دورانیے تک جاری رہے اور ہر امدادی معاون سے ماہانہ اعانت دینے کی گزارش کریں اور ترکی اور مصر کے ذریعے ترسیل زر اور اشیاء کا مستحکم انتظام کیا جائے۔

اس ضمن میں ہمیں دہریہ جماعتوں سے اشتراک عمل سے گریز کرنا چاہیے کیونکہ وہ جو امداد دیں گیں وہ اعانت جہاد کے لیے نہیں بلکہ سامراجی ہیومن رائٹس کے تحفظ کے لیے ہو گی۔ اس کے برعکس ہم جو امداد مہیا کریں گے وہ صرف اور صرف حماس کو اسکے قابل اعتبار ذرائع کے توسط سے فراہم کی جانی چاہیے کسی فلاحی ادارے کو نہیں۔ حماس سے مکالمے کے ذریعہ یہ طے کیا جائے کہ کن ذرائع سے امداد براہ راست حماس تک پہنچائی جاسکتی ہے۔

اسلامی امدادی فراہمی کے تناظر میں دو جماعتیں ہماری فطری حلیف ہو سکتی ہیں۔ جمعیت علمائے اسلام اور مجلس اتحاد المسلمین۔ یہ دونوں جماعتیں اعانت جہاد میں فعال ہیں۔ امدادی مہم میں ان سے اشتراک عمل مفید ہو سکتا ہے تاکہ تمام پاکستانی امداد (غیر سرکاری) صرف حماس تک پہنچے۔

ہمارے مظاہروں میں جو ہزاروں افراد شریک ہوئے ان کو مسجد کی بنیاد پر مقامی اعانتی فلسطینی کمیٹیوں میں منظم کرنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔ ان کمیٹیوں کے ذریعہ اعانت اکٹھا کی جاسکتی ہے۔ حکومت کے سامراج نواز اقدامات کی مزاحمت بھی کی جاسکتی ہے اور جہاد سے متعلق اطلاعات بھی مقامی سطح تک پہنچانے کا انتظام کیا جاسکتا ہے۔

اسرائیل مشرق وسطیٰ میں امریکہ کی سب سے اہم فرنٹ لائن ریاست ہے۔ فلسطین جہاد کی

اعانت میں امریکا کو ہدف بنانا نہایت ضروری ہے۔ پاکستان اور دیگر مسلم ممالک میں ہم امریکا کو اعانت اسرائیل کی بھاری قیمت ادا کرنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ یہ قیمت سفارتی بھی ہو سکتی ہے، اقتصادی بھی اور ثقافتی بھی۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ۲۹ اکتوبر کے امریکا مخالف مظاہرہ میں جو ہم نے اسلام آباد میں منعقد کیا اس کو امریکی سفارت خانے تک نہیں پہنچنے دیا گیا اور ہم نے پولیس کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ ہمیں اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ امریکا سے مخالفت پاکستانی انتظامیہ اور حکومت سے مقابلہ کے بغیر ناممکن ہے کیونکہ یہ انتظامیہ اور حکومت امریکا کی باجگزار ہے۔ لہٰذا ہمیں امریکی سفارت خانوں اور لاہور، کراچی وغیرہ کے قونصلیٹ میں دھرنے دینے کی بھرپور کوشش کرنی چاہیے خواہ اس کے لیے ہمیں جانی اور مالی قربانیاں دینی پڑیں۔ پاکستان میں اعانت جہاد فلسطین کا یہ سب سے موثر طریقہ ہے۔

ہمارے قائدین کو حکومت کی امریکہ نوازی پر کڑی تنقید مستقل جاری رکھنی چاہیے اور ہمیں مطالبہ کرنا چاہیے کہ امریکا سے تمام سفارتی اور تجارتی تعلقات اس وقت تک معطل کی جائیں جب تک امریکا غزہ کے علاقہ میں اسرائیل کی اعانت کرتا رہتا ہے۔

ہمیں ملک گیر سطح پر امریکی امدادی کارروائیوں بالخصوص یو ایس ایڈ کے پروگراموں کی مزاحمت جاری رکھنے کی منظم جدوجہد کی جانی چاہیے اور امریکی بزنس اور فرنچائز کی تالہ بندی اور امریکی مصنوعات اور خدمات کے بائیکاٹ کی دیرپا مہم مرتب کرنا چاہیے۔ اس قسم کی مزاحمت عراق اور لیبیا اور لبنان میں مستقل جاری ہے اور پاکستان میں اس کو منظم طور پر برپا کرنے کے امکانات موجود ہیں۔

ہماری ۲۰۲۴ء کی انتخابی مہم میں اعانت جہاد فلسطین ایک اہم تھیم ہو اور اس بنیاد پر عوامی اسلامی جذباتیت کو ابھارنے کی بھرپور کوشش کرنی چاہیے۔ ہمیں عوام کو باور کرانے کی کوشش کرنا چاہیے کہ جماعت اسلامی کو ووٹ دینا سامراج مخالفت اور اعانت جہاد فلسطین کا ایک اہم اور موثر طریقہ ہے۔

Editorial

Ulema, Islamic Parties, and the Imperative of Redefining the National Interest

Nationalism is a very strong force in the Indo-Pak subcontinent. The Independence Movement was based on the creation and increase of national consciousness among both Hindus and Muslims. Consequently, both Hindu and Muslim masses became committed to Muslim nationalism and Hindu nationalism, respectively.

The question then becomes: How are we to face the pervasive spread of nationalism in the country?

Nationalism is a capitalist ideology. Its purpose is to dispossess adversaries and concentrate resources and power in the hands of the nation constructed by the nationalists. This problem of commitment to the ideals of capitalism and modernism has become deeply embedded in nationalist thinking.

A lesson, at least in part, can be learned from the experience of the Chinese people. In 1927, Mao decided that socialism alone could not be the sole raison d'être of the Chinese revolution. Therefore, he skillfully combined the national struggle with the communist struggle, a strategy that eventually led to the dominance of communist ideology over nationalism. This led to the emergence, at least in part, of a group of people more committed to communist

ideology than to any nationalist struggle. And, at least until his death, a group of committed communists always remained at the top in China.

Our problem, however, is quite different. We do not espouse a capitalist ideology, and we must convince people to reject capitalism as a system in a very fundamental manner. Therefore, the creation of a group and social consciousness of Islamic identity is extremely improbable in a milieu dominated by capitalist consciousness, especially in its nationalist form. Thus, the creation of Islamic consciousness can only be undertaken by extensively linking the revolutionary struggle with the struggle for the decapitalization of civil society.

Therefore, the struggle is for a redefinition of the national interest in Islamic terms, rather than accepting that Pakistan's national interest is similar to that of all other capitalist countries in the world.

We should recognize that Pakistan is an exceptional state. Like Afghanistan, Pakistan is exceptional in the sense that its national interest lies in the weakening of capitalism globally, and particularly first in the region where Pakistan exists. So, we must first create social awareness of what is required for the development of an Islamic society and Islamic institutions based at the grassroots level.

Unless the struggle to create Islamic consciousness

at the social and grassroots levels takes place continuously, we can never benefit from a revolutionary situation. We can never benefit from a war-like situation, because such a situation will intensify nationalist consciousness. Therefore, we must develop a conscious strategy to weaken national consciousness and strengthen Islamic consciousness, reinterpreting national consciousness in light of Islamic principles by undertaking social organization and institutionalization.

This approach has been completely missing from the agenda of Pakistani revolutionary parties. As a result of the continuous war situation we have faced, we will only see nationalism's grip stretching further over the consciousness of the average Pakistani. This is extremely dangerous because, in present circumstances, nationalism is merely a prelude — an apology — for submission to imperialism.

What has happened is that both India and Pakistan have submitted to America, and America has gained the real benefits from this conflict. As nationalism grows, the tendency of the masses to accept either American or Chinese hegemony becomes necessary for promoting and safeguarding their perceived national interests. As national consciousness and, consequently, subservience to imperialism increases, the chances for any revolutionary struggle will

decrease.

Therefore, linking the development of social, institutional, and ideological infrastructure with the struggle against imperialism and nationalism is crucial. This is essential if Islamic revolutionaries are to develop a consciousness that can benefit from a war-like situation and ultimately defeat imperialism in this country.

The fact is that the revolutionary process always gains from a war situation. For example, the Russian Revolution occurred in 1917, three years into a world war. The Chinese Revolution occurred in 1949, following the Chinese Communist Party's victory in the world war, defeating both the Japanese and their American allies.

The question is, what have the Islamic revolutionary forces of Pakistan learned from this revolutionary process?

Actually, the victory of revolutionary forces during wartime arises from the ideological differentiation they successfully make from the nationalist position. For instance, the Russian revolutionaries, the Bolsheviks, strongly opposed the Tsarist government's nationalist programs and distinguished their workers' ambitions from this ideological perspective.

Now, if the national interest is considered the common interest of the entire country — the common

interest of all the people — then there is no chance for achieving a systemic overthrow. The system revolves around a particular conception of the national interest. The national interest must be distinguished from the interest of a particular group that seeks to dominate the system.

In Russia, of course, this group was the Bolshevik party, representing the labour class and the proletariat. In an Islamic state, it cannot be a particular class, because Islam recognizes no class in society.

Therefore, we must attempt to create a consciousness that is specifically Islamic. Particularly notable in this war with India, for example, has been the fact that Islamic parties, in their enthusiasm and almost total commitment to Pakistan's victory and cause, have completely forgotten, or more or less completely forgotten, about the worldwide struggle for Islamic revolution, particularly the struggles in Palestine and Gaza. The stance of Pakistani parties on issues confronting the country has been indistinguishable from that of other nationalist parties.

In fact, nationalism is the greatest enemy of Islam. And when people become nationalists, it is impossible for them to identify with the particular interest of Islam.

A Note on Women's Access to Dawah Activities

Working Group on Afghan Economy

The imperialists are specially targeting our women to corrupt them and pollute Islamic society with the evil of human rights ideology. This strategy has proved particularly effective in Iran where a mass feminist movement has been organized and is now the spearhead of the counter-revolutionary movement against the Islamic government.

We must make no concession to the imperialist agencies on the women's question.

The steps taken by our government to restrict women's participation in public life are very necessary but they must be supplemented by positive measures to promote religiosity and spirituality among women at the mass level.

This requires the rapid extension of the dawah among women. The exclusive women madrasah network can serve as the focal point of this dawah activity among the women.

The madrasah provides the natural environment for promoting religiosity and spirituality among the masses. The madrasah will serve as an education center for enhancing religious knowledge and some essential skills/ literacy among women, as well as it can be used to impart general household management,

health and education training programs. The IEA's womenfolk will be served by women who have completed these mandatory trainings.

Tableeghi jamaat also involves womenfolk in dawah activities under strict supervision & company of their Mehrams.

WGAE recognizes that IEA is a traditional tribal society where women's role has been restricted and it has borne good fruits by keeping culture at check and maintaining strong family structures. Now in a changed environment of imperialist attack on Afghan culture it has become a necessary step to prevent the secularization of society. Therefore, tribal chiefs, clan heads and other community leaders must be persuaded to accept women's participation in madrasah as an Islamic alternative to their involvement in the work of imperialist financial CBOs and NGOs.

Dawah work among women (and the masses in general) must be focused on debunking human rights ideology and propaganda. This is a crucially important task at this stage of the revolution to delegitimize the main ideological argument for imperialist intervention within Afghan society.

It is urgently necessary to launch a long-term nationwide campaign against human rights ideology. WGAE would be grateful to be informed about what

is being done in this regard urgently.

The key issue is to contrast human rights with حقوق العباد. The Islamic government must appear in the eyes of the masses as the main provider and protector of حقوق العباد.

As far as women are concerned the Islamic government must function as the main protector of the حقوق العباد of the wife, the mother and the daughter ensuring حقِ وراثت and حق مہر and reviewing the نظام کفالت to ensure that female headed households are adequately provided for.

The experience of the Islamic Republic of Iran has shown that campaigns for birth control and population planning have played a major role in corrupting women.

Iran provided such facilities during the 1990s and now realizes the folly of doing this and is re-abandoning these practices.

We must immediately discontinue all imperialist programs for the distribution of contraceptives and all imperialist attempts at discouraging early marriages.

It is especially important to immediately halt all psychological support programs of the UN and the NATO financed Humanitarian Group in Afghanistan targeting women and youth.

ideology than to any nationalist struggle. And, at least until his death, a group of committed communists always remained at the top in China.

Our problem, however, is quite different. We do not espouse a capitalist ideology, and we must convince people to reject capitalism as a system in a very fundamental manner. Therefore, the creation of a group and social consciousness of Islamic identity is extremely improbable in a milieu dominated by capitalist consciousness, especially in its nationalist form. Thus, the creation of Islamic consciousness can only be undertaken by extensively linking the revolutionary struggle with the struggle for the decapitalization of civil society.

Therefore, the struggle is for a redefinition of the national interest in Islamic terms, rather than accepting that Pakistan's national interest is similar to that of all other capitalist countries in the world.

We should recognize that Pakistan is an exceptional state. Like Afghanistan, Pakistan is exceptional in the sense that its national interest lies in the weakening of capitalism globally, and particularly first in the region where Pakistan exists. So, we must first create social awareness of what is required for the development of an Islamic society and Islamic institutions based at the grassroots level.

Unless the struggle to create Islamic consciousness

at the social and grassroots levels takes place continuously, we can never benefit from a revolutionary situation. We can never benefit from a war-like situation, because such a situation will intensify nationalist consciousness. Therefore, we must develop a conscious strategy to weaken national consciousness and strengthen Islamic consciousness, reinterpreting national consciousness in light of Islamic principles by undertaking social organization and institutionalization.

This approach has been completely missing from the agenda of Pakistani revolutionary parties. As a result of the continuous war situation we have faced, we will only see nationalism's grip stretching further over the consciousness of the average Pakistani. This is extremely dangerous because, in present circumstances, nationalism is merely a prelude — an apology — for submission to imperialism.

What has happened is that both India and Pakistan have submitted to America, and America has gained the real benefits from this conflict. As nationalism grows, the tendency of the masses to accept either American or Chinese hegemony becomes necessary for promoting and safeguarding their perceived national interests. As national consciousness and, consequently, subservience to imperialism increases, the chances for any revolutionary struggle will

decrease.

Therefore, linking the development of social, institutional, and ideological infrastructure with the struggle against imperialism and nationalism is crucial. This is essential if Islamic revolutionaries are to develop a consciousness that can benefit from a war-like situation and ultimately defeat imperialism in this country.

The fact is that the revolutionary process always gains from a war situation. For example, the Russian Revolution occurred in 1917, three years into a world war. The Chinese Revolution occurred in 1949, following the Chinese Communist Party's victory in the world war, defeating both the Japanese and their American allies.

The question is, what have the Islamic revolutionary forces of Pakistan learned from this revolutionary process?

Actually, the victory of revolutionary forces during wartime arises from the ideological differentiation they successfully make from the nationalist position. For instance, the Russian revolutionaries, the Bolsheviks, strongly opposed the Tsarist government's nationalist programs and distinguished their workers' ambitions from this ideological perspective.

Now, if the national interest is considered the common interest of the entire country — the common

interest of all the people — then there is no chance for achieving a systemic overthrow. The system revolves around a particular conception of the national interest. The national interest must be distinguished from the interest of a particular group that seeks to dominate the system.

In Russia, of course, this group was the Bolshevik party, representing the labour class and the proletariat. In an Islamic state, it cannot be a particular class, because Islam recognizes no class in society.

Therefore, we must attempt to create a consciousness that is specifically Islamic. Particularly notable in this war with India, for example, has been the fact that Islamic parties, in their enthusiasm and almost total commitment to Pakistan's victory and cause, have completely forgotten, or more or less completely forgotten, about the worldwide struggle for Islamic revolution, particularly the struggles in Palestine and Gaza. The stance of Pakistani parties on issues confronting the country has been indistinguishable from that of other nationalist parties.

In fact, nationalism is the greatest enemy of Islam. And when people become nationalists, it is impossible for them to identify with the particular interest of Islam.

Islamic Revolutionary Struggles

The Islamic Case for Excluding Women from Public Order

Javed Akbar Ansari

The Islamic Emirate of Afghanistan's stance on women's role in national life is viewed with suspicion even among some Islamic circles. This is especially so with regard to the Islamic government's decision to exclude women from higher education. This paper seeks to present the Islamic case for the general exclusion of women from public order.

We begin by clarifying the nature of the distinction between public and private order.

Private and Public Order

Private life is that sphere of existence in which individual consciousness is formed. Most world religions – Islam, Judaism, Christianity, even Hinduism – recognize the primacy of private life in the formation of being. That is why a large proportion of Sharia injunctions relate to the private life of the individual.

Liberalism – and most idealist thinkers – at least theoretically acknowledge the primacy of private life in social order. But they view the formation of individual consciousness as unproblematic. It is assumed that everyone is naturally selfish, pleasure and power seeking.

Socialists and nationalists in general reject the primacy of private order and believe that individual consciousness is formed in public order through communicative interaction. Man in this view is a species being and forms his nature through interaction

in a community of "associated producers".

Islam rejects – as does non-revisionist Christianity – the liberal and socialist conceptions of being. According to Islam man possess both angelic and bestial qualities. He is inclined both to the satisfaction of his biological desires and to the fulfilment of his spiritual needs.

The private circle is the principal sphere for the nurturing of the spiritual qualities of man.

The family is the principal source for the nurturing of man's spiritual qualities and the principal agent for creating individual moral consciousness are the mother and the wife.

Women rule the private sphere within Islamic society. Their rights and duties are all centered on their role as queen of the household – their rights and duties are fully elucidated in the edict on the subject issued by Hazrat Ameer-ul-Moumineen issued in the early days of the Revolution in January 2022.

Love, selflessness, devotion and the spirit of sacrifice are nurtured constantly and continuously by the acts of the wife and the mother.

Creating and sustaining Islamic consciousness is a full time, life-long activity and the indispensable means for the nurturing of femininity. That is why Islam relieves the women of the duty to participate in production and governance – the sphere of the public order.

Women's participation in production and governance necessarily destroys femininity and erodes family life and family life disintegration implies the

deconstruction of Islamic individuality – the nurturing of the spiritual qualities of man's being.

The Capitalist Attack on Femininity

Despite its valorization of chastity, Christianity paved the way for capitalism's sustained attack on femininity. It did so by devaluing the status of the mother and the wife through its institution of nunhood (separating women from the family sphere). From the Convent to the Factory was an easy transition.

Christianity's subsumption within capitalism's civil society is so comprehensive that late Pope Francis had become an advocate of homosexuality rights.

Capitalism's attack on femininity began in the 19th century and is now in full cry.

This attack has taken two forms. First, the commodification of female labor is almost complete in the West and growing rapidly in non-Muslim South and East Asia (especially in China and India). Secondly, the commodification of women's bodies has led to the development of pornography and entertainment as the leading industries of the world.

The Feminist movement demands greater women's participation in capitalist civil society – more jobs, more access to governance roles, more sexual freedom, more defeminization, more "relief" from child and elderly care responsibilities. The Feminist movement is in effect a movement for the defeminization of women through a revalorization of the role of the mother and wife.

As our master Hazrat Maulana Muhammad Marmaduke Pickthall – may Allah bless him – taught,

capitalism is essentially a spiritual force – the spirit of *takathur*. This spirit seizes control of man's labour and man's wealth to produce and reproduce capitalist individuality – an individuality dominated by the vices of avarice (hirs) and covetousness (hasad).

Capitalism stands Christianity on its head. Christianity regarded avarice and covetousness as evil to be suppressed through penance and prayer. Capitalism celebrates the universal practice of avarice and covetousness.

Creating capitalist individuality requires the destruction of private life – the sphere of the family for the nurturing of love, devotion and self-sacrifice. Capital penetrates the private sphere in its perpetual quest for the commodification of all aspects of being. It cannot tolerate the existence of the mother and the wife – the embodiments of love, devotion and self-sacrifice. It crushes femininity hypocritically calling it Feminism. The capitalist individual is an isolated, alienated being who knows nothing of love or self-sacrifice. He is human capital obsessed with the desire to relentlessly accumulate through the praxis of capitalist rationality.

The Imperialist Assault on Femininity

Having destroyed femininity in the West and in much of East Asia, imperialism is seeking to destroy it in the Muslim world and especially in the Islamic states of Iran and Afghanistan. The attack on femininity is especially strong and protracted in Afghanistan.

The imperialists who killed about 193,000 women

and injured 1.7 million women (not to count those women who were widowed, lost their sons and fathers in imperialist air raids) are now shamelessly championing women's "rights" – the "rights" to submit to capitalist production and governance processes.

The imperialists seek the destruction of traditional Afghan Muslim society in the hope that this will eventually lead to a delegitimation of Islamic rule and the replacement of the Islamic government by a pro-imperialist administration.

Spreading lewdness in Afghan society is a major aim of imperialism – after all UN staff are notorious for the sexual crimes they have frequently committed in Sub-Saharan Africa and Latin America.

Imperialism seeks the commodification of private life in Afghanistan.

The stance of the Islamic government is in line with mainstream Islamic teachings and also in line with the practices in Islam's pre-imperialist twelve hundred years of history.

Women were excluded from participation in public life in all Islamic societies in the pre-imperialist societies. In no Muslim society prior to the imperialist era were provisions made for women's higher education or for their professionalism in production and governance processes.

Indeed, higher education facilities for women were not provided in pre-capitalist Christian, Jewish and Hindu social order either. Contemporary higher education is a capitalist invention, participation in

which necessarily leads to the destruction of femininity.

If Islamic social order is to be preserved in Afghanistan the sanctity of family/private life has to be assured and the capitalist mode of production is to be rejected.

The Islamic government must continue to stand firm on the stand it has taken resisting the imperialist assault on femininity.

The disastrous consequence of any relaxation in this regard has already been seen in the Islamic Republic of Iran where participation of women in public life has been legitimated on the basis of isolated exceptional incidents reported in the Nusus (it should be noted that no general principles (usul) have been derived from these isolated incidents by our fuqaha including Jafri fuqaha).

The result is that Feminism has emerged as a leading anti-Islamic, pro-imperialist, political and social movement in the Islamic republic of Iran.

Similarly, the participation of women in higher education institutions and the armed forces has led to an explosion of ghair nikahi marriages and an unprecedented abuse of the muta' contract throughout Iranian society.

Facilitating women's participation in public order endorses the revalorization of femininity. It is a means for undermining the religious character of Afghan society and for enabling a capitalist society in Afghanistan. In-Sha-Allah we will not fall into this imperialist trap.

Three Characteristics of New and Old Khawarij: A Conceptual Note

Ali Muhammad Rizvi

A Note on Scope

This article is a conceptual note aimed at understanding the present Islamic Revolutionary Struggles and their contemporary challenges and prospects. It is not a study in traditional or modern Islamic schools of thought, nor does it pass judgement on them. Readers unable to differentiate between these two distinct approaches are advised to consider this context before proceeding.

It is well-established that the old Khawarij were extreme literalists. While not every literalist is a Khariji, it is a fundamental characteristic that every Khariji exhibits literalism at some point. This rigid adherence to literal interpretation often left little room for contextual understanding or nuance, leading to their uncompromising stances.

The second key characteristic of the old Khawarij was their fervent idealism. An idealist believes that the gap between an ideal and reality can be entirely overcome; they're convinced that the ideal can be perfectly implemented in the real world. This belief fueled their desire for an unblemished, pure society.

Conversely, a realist prioritizes practical implementation. While realists cannot entirely disregard ideals, their primary concern is ensuring tangible outcomes are achieved on the ground. When faced with a choice between strict adherence to ideals and the dictates of reality, a realist will always sacrifice

the former for the latter, understanding that compromise is often necessary for progress.

Finally, a revolutionary maintains sight of ideals but also recognizes that they will always be implemented imperfectly; true perfection is unattainable in this world. This is why paradise exists; we are not here to create it.

We cannot create paradise in this world; our purpose is to strive our utmost to reshape reality according to our ideals, yet a distance will always remain between reality and ideals.

The crucial point is a continuous striving to get closer to ideals. However, ideals cannot become reality, because as soon as they are part of our reality, they cease to be ideals. Another way to phrase this is that ideals serve to spur us to action. Once implemented in reality, they recede further, maintaining the essential gap between reality and ideals and thus preserving the ultimate motivation for action. Again, not every idealist is a Khariji. Idealism can lead to diverse worldviews. However, being an idealist is integral to being a Khariji; one must be an idealist to be a Khariji. Thus, a Khariji is both a literalist and an idealist.

The third and final characteristic of Khawarij, which is their defining trait, is that they are anarchists. An anarchist believes that men should not rule; instead, only ideals should govern. However, ideals and institutions cannot rule by themselves; they rule through men and women. So, Kharijism is a form of anarchism manifested through idealism and a

practical rejection of the institutions of the Khilafat and the Islamic state (since every actual manifestation will necessarily fall short of the ideal).

Old Khawarij were hyper-activists, prepared to fight against and destroy anything that fell short of their standards. However, activism wasn't an integral element of their creed or logically entailed by it. One could easily have chosen a secluded life away from the impure reality. Therefore, in principle, Khariji thought is compatible with extreme passivism.

In fact, one could argue that the logical conclusion of Khariji thought is an extreme form of passivism and the acceptance of reality in one form or another. Indeed, the main harm inflicted by the old Khawarij was upon the institutions and rulers who were rightly guided. In later centuries, perhaps due to exhaustion or because the new rulers were more realist and less concerned with right, wrong, and justice, they were able to deal with them more harshly. They had met their match in a new breed of ruthless rulers.

The Neo-Khawarij

Neo-Khawarij share many characteristics with the old Khawarij. Like their predecessors, neo-Khawarij are idealists. They reject Islamic institutions and actions that fall short of their ideal types, often leading to a paralysis of action due to their pursuit of an unattainable perfection. Like the old Khawarij, the new Khawarij ultimately end up passively or actively supporting the status quo through their undermining of effective change.

Today's Khawarij are also, in one way or another,

literalists. They selectively use their literalism against opponents to discredit their efforts, often highlighting minor deviations from a perceived ideal while overlooking greater injustices.

Like the old Khawarij, the new Khawarij's literalism is connected to their sincere or feigned idealism.

Finally, new Khawawarij, like the old ones, are anarchists. However, the anarchism of the new Khawarij is not easily understood, especially the stream that indulges in extreme passivism.

They are anarchists in the sense that they undermine the struggle for new Islamic institutions and self-organisation. By demanding an impossible purity, they inadvertently dismantle efforts to establish viable alternatives. Like the old Khawarij, the new Khawarij, wittingly or unwittingly, end up supporting oppressive and non-Islamic regimes and institutions, as their critiques often weaken the very forces striving for change.

Neo-Khawarij today can be broadly divided into activist and non-activist passivist Khawarij. Both streams are literalists and idealists in their own way, and they are anarchists in their own unique way.

The motivations of the neo-Khawarij also vary. One large group is clearly driven by personal gains and rationalizes their position with reference to what can be termed Khariji tropes, effectively using these arguments as a shield for inaction or self-interest (and one should not be misled by the fact that many of them might call their opponents Khawarij themselves!).

Extreme passivism and anti-activism (manifesting

as a rejection of all struggles and what is generally termed political Islam and Islamists) is justified and rationalized on grounds structurally similar to old Khariji thought, but serving non-action rather than action, and directed against those who are taking action.

The motivation for this can vary. One might be a passivist simply because they are an agent of the ruling system and wish to avoid any struggle to overcome or overthrow that system. Thus, they content themselves and create arguments for themselves and others to justify their non-involvement. You might even be sincere in your rationalization, believing that non-action is better for Islam than action, and that action does more harm.

In the first case, you are merely using Khariji arguments and rationalizations without necessarily believing in them. In the second case, you might genuinely believe those arguments but use them to justify non-action and anti-action rather than action.

The critique of Jihad, and political struggle is based on all three Khariji tropes.

It draws on idealism. The political struggles and Jihad against Imperialism and its agents are messy, which clashes with the neo-Khawarij's idealist ethical sensibilities. They are shocked by the shortcomings of the righteous side but seem less shocked by existing unjust and oppressive systems, creating a moral imbalance in their critique.

They do not deny the legitimacy of Jihad but impose impossible conditions upon it, which amounts to its practical denial (in this context, I have previously

referred to them as neo-Qadiyanis).

Here, old Khariji idealism is at work in reverse. Some of them claim that the Prophet (may the choicest blessings of Allah be on our master and his blessed family and friends) transformed Arab pagan society primarily through his good morals, manners, and etiquette, and that if we espoused those morals, the whole world would flock to Islam. They seem shocked by the conduct and manners of existing Muslims today, viewing them as the cause of the non-guidance of the Kuffar and oppressive rulers (like the old Khawarij, their harshest strictures are reserved for Muslims and the oppressed).

The activist neo-Khawarij are also the fiercest critics of Islamists and Mujahideen. They wage struggles against existing Islamic states like Iran and Afghanistan, which in their opinion, have deviated from the right path through compromises or by espousing wrong or less than ideal ideologies or stances. They have waged war against these Islamic regimes and killed their dignitaries and Muslims living in these states in general. They are witting or unwitting tools of imperialism and non-Islamic forces, mirroring the mainstream of the old Khawarij.

Similarly, they are the harshest enemies of Islamic revolutionary parties throughout the Muslim world. Like the first group, their harshest strictures and wrath are directed against Muslims rather than Kuffar. They wage struggles against vulnerable Islamic states and institutions encircled by Dar al-Harb, worsening their vulnerabilities and weakening them vis-à-vis imperialist agencies and states. They effectively do the work of America and her allies.

The Geopolitical Reality: Iran, the US, and the Shifting Sands of the Middle East

An Afghan perspective on the war

Dr. Abdul Hadi

I observe that those with a superficial understanding of the current conflict between Israel and Iran often dismiss deeper analyses as mere conspiracy theories, even in the face of unfolding events. However, a closer examination reveals that, much like the established conflicts between North Korea and the United States, or Russia and Ukraine, the nearly forty-seven-year rivalry between Iran and the United States is also a tangible reality.

The principal motivation behind this enduring animosity, I contend, is the United States' commitment to safeguarding Israel and its other regional allies, such as Saudi Arabia, Qatar, and Jordan, from what it perceives as an Iranian threat. In pursuit of this objective, the US has sought to diminish Iran's influence by undermining its allies in geographically proximate nations where Iran held considerable sway, notably Syria and Lebanon.

Furthermore, I suggest that the religious and political leadership in Iran has inadvertently contributed to the weakening of their society. By establishing what I describe as "democracy and by granting freedoms to women," the Islamic government has, in my view, diluted its Islamic religious identity. Paradoxically, I highlight Iran's practical and courageous support for Hamas, marking it as its first substantial backing of a Sunni group.

Biding their time, our adversaries have now launched an attack, successfully targeting Iran's top military and nuclear leadership, and, critically, our nuclear facilities. I posit that, following these setbacks, the Iranian leadership faces a stark choice for maintaining its honour: Iran must abandon its current "status quo" and initiate a full-scale war against its enemies—the United States and Israel (like Mullah Muhammad Omar Mujahid RA).

I suggest that targeting American interests in the Middle East would be a comparatively straightforward endeavour. Should Iran's current Islamic religious leadership fail to take such decisive action, I warn, it risks losing its 47-year grip on power.

From the perspective of the Muslim Ummah, there is a distinct possibility that this conflict could escalate and spread to the domains of the Arab rulers. Such a scenario, I speculate, could not only weaken Iran but also destabilize the current Arab and Turkish leadership, thereby creating an opening for Islamist and jihadist groups to operate within their societies. However, I prudently qualify this analysis by noting the current absence of the necessary groundwork and arrangements for such a widespread movement on the ground.

For the Islamic Emirate, I conclude, it is imperative that it does not become a proxy for Arab rulers against Iran in this conflict. I caution that a change in the Iranian Islamic system leading to the establishment of a pro-American government would pose a persistent challenge to the Emirate.

Capitalism and Fianance

Pakistan's Economic Subordination and the Failure of Stabilization: A Critical Review in the Light of Dr. J.A. Ansari's Framework

Syed Muhammad Younus Qadri

(Inspired by Dr. Javed Akbar Ansari's "Economic Prospects for 2025 and the Proposed Islamic Revolutionary Response" published in *Islami Inqilab*, 1(2): 170-182).

Introduction

As Pakistan enters the latter half of 2025, its economy remains entrenched in a deep structural crisis, despite an appearance of macroeconomic stability. This "stability" isn't the fruit of internal growth or productivity, but rather a managed façade, engineered under the supervision of the International Monetary Fund (IMF) and maintained by the ruling coalition—a coalition firmly backed by the military establishment and aligned with global capital interests. As Dr. J. A. Ansari predicted, the neoliberal technocratic régime has intensified Pakistan's subservience to financial imperialism, pushing the economy further into what he terms "immiserising stabilization."

History of SAP and EFF in Pakistan

Pakistan's experience with externally imposed economic reform began with the Structural Adjustment Programme (SAP) in 1988. Signed during Ghulam Ishaq Khan's interim presidency, this marked the start of IMF-led liberalization, devaluation, and austerity. The first SAP imposed currency devaluation, subsidy removal, and cuts in development spending.

It was extended through the 1990s under alternating Nawaz and Benazir governments, accelerating privatization and deregulation. However, these measures resulted in stagnation, rising debt, and growing trade deficits. By 1999, the SAP collapsed amidst economic crisis.

The Extended Fund Facility (EFF) replaced SAP-style programmes from 2001 onwards. Pakistan has signed five major EFF agreements since then: 2001 (Musharraf), 2008 (Zardari), 2013 (Nawaz Sharif), 2019 (Imran Khan), and the latest in 2023–25 (coalition government). While they differ in packaging, all EFFs retain the core neoliberal conditions of austerity, privatization, and fiscal consolidation. These agreements have deepened Pakistan's debt dependency and failed to generate sustainable growth.

The IMF Agenda and Pakistan's Year of Manufactured Stabilization

The fiscal year 2024–25 has been widely described as "the year of the IMF." Under the leadership of Finance Minister Muhammad Aurangzeb—a dual Dutch-Pakistani banker—Pakistan resumed the IMF's Extended Fund Facility (EFF). The loan package came with stringent conditions, including currency devaluation, monetary tightening, subsidy withdrawal, and energy price hikes. While headline inflation reportedly fell from 29% to under 5% by early 2025, and a modest current account surplus emerged (thanks to import compression and record remittances of USD 33 billion—primarily from the GCC and UK), the overall economic picture remains bleak. The trade

deficit remains structurally high, with merchandise imports at USD 58 billion and exports at just USD 30 billion, resulting in a USD 28 billion gap. This apparent "stabilization" is not rooted in sustainable economic recovery. Key indicators reflect the adverse long-term effects of Structural Adjustment Programmes (SAPs) and successive EFF arrangements:

GDP Growth has slowed significantly—from around 5.5% in 1988 (pre-SAP) to just 2.3% in 2025, falling short of population growth and indicating economic stagnation.

Trade Deficit has ballooned from under $2 billion in 1988 to over $28 billion in 2025, as industrial competitiveness eroded and dependence on imports grew.

Current Account remains precariously balanced—not due to strong exports, but because of remittances. This balance is fragile and unsustainable, hinging on external income rather than internal productivity.

Public Debt, once about 35% of GDP in 1988, has more than doubled to over 75%, driven by frequent borrowing to meet fiscal and external obligations.

Industrial Output has contracted, with the sector's share in GDP falling from over 20% in 1988 to less than 12% in 2025. Large-scale manufacturing shrank by 3.4% in early 2025 alone, highlighting deep de-industrialization.

Poverty has worsened, rising from below 25% in 1988 to over 40% in 2025. Declining real wages, high unemployment, inflation, and austerity-driven spending cuts have eroded living standards.

From 1980 to 2025, Pakistan's inflation history reflects a pattern of fluctuating price levels driven by both domestic economic mismanagement and global economic shocks. In the 1980s, inflation remained moderate, averaging around 7%, but began to rise towards the end of the decade due to fiscal imbalances and the initial phase of Structural Adjustment Programmes (SAPs). The 1990s saw greater volatility, with an average inflation rate of about 9.5%, peaking at over 14% in 1994–95, largely due to currency devaluation, subsidy withdrawals, and IMF-imposed austerity. The 2000s began with relative stability but culminated in a sharp spike in 2008, when inflation hit 25% amidst global food and oil price surges. The 2010s showed moderate levels again, averaging around 8%, though pressures re-emerged by 2020. The 2020s have been the most turbulent, with inflation reaching a historic high of over 30% in 2023, fueled by political instability, currency depreciation, and rising energy prices. Although inflation eased to around 12% in 2024–25, the overall decade has averaged nearly 18%, reflecting ongoing structural weaknesses and dependency on external financial programmes.

The Myth of Stabilization and Structural Collapse

The purported stabilization of Pakistan's economy is an illusion. While it may have met statistical objectives, it has simultaneously choked genuine economic expansion. Since the 1988 Structural Adjustment Programme (SAP), both industrial and agricultural output in Pakistan have dwindled, and investment in productive sectors has collapsed. Failed

privatisation efforts, plagued by dwindling investor confidence and internal opposition, have merely redirected capital towards unproductive, speculative ventures like real estate and securities. Alarmingly, trade and fiscal deficits persist, with over 70% of federal revenues now consumed by debt repayments, severely compromising crucial public development spending.

The Political Economy of Subordination

The current Pakistani regime is neither neutral nor technocratic; it functions as a comprador arrangement, actively facilitating imperialist economic control. The International Monetary Fund (IMF) programme rigidly imposes austerity, deregulation, and dependency, with the military and elite bureaucracy ensuring unwavering compliance. Alarmingly, capital repatriation by foreign firms has soared to unprecedented levels, even as Pakistan's national reserves remain precariously reliant on rollovers and external goodwill. Meanwhile, Islamic political parties have utterly failed to mount any meaningful resistance, offering little more than moral outrage devoid of viable policy alternatives. Their glaring silence on IMF subjugation starkly exposes a profound absence of revolutionary vision.

Import Substitution and case for a Sovereign Economy

When Pakistan initially adopted the Structural Adjustment Programme (SAP) in 1988, its economic indicators were far more robust: GDP growth exceeded 5.5%, and the trade deficit remained below USD 2 billion. At that juncture, the nation operated a

largely sovereign, self-reliant economy, underpinned by robust domestic agriculture and manufacturing. The subsequent SAP reforms systematically dismantled this hard-won sovereignty, forcibly imposing external control and transforming a once-productive economy into a dependent debtor state.

Today, Pakistan's only viable path to overcoming its crippling trade deficit lies in a decisive return to an import substitution strategy. Prioritizing local production in critical sectors such as pharmaceuticals, electronics, agro-processing, and construction materials would not only significantly reduce reliance on imports but also retain vital capital domestically and build long-term economic resilience. A truly sovereign economic model would necessitate strategic state-led planning to actively prioritize domestic industries, meticulously manage capital flows, and ensure productive investment for sustainable national development.

Overall Economic Impact of SAPs and EFFs in Pakistan

Metric	**1988 (Pre-SAP)**	**2025 (Under EFF)**
GDP Growth	~5.5%	~2.3%
Trade Deficit	< $2 billion	> $28 billion
Current Account	Balanced/low	Balanced due to remittances
Public Debt (% of GDP)	~35%	> 75%
Industrial Output Share	>20%	<12%
Poverty Rate	<25%	>40%
Inflation Rate	~7%	~12%(average ~18%

		in 2020s)

Towards a Revolutionary Islamic Economic Response

Pakistan's current economic strategy—a pursuit of stabilization without sovereignty—is fundamentally unsustainable. The stringent conditionalities imposed by the International Monetary Fund (IMF) have led directly to mass immiseration, pervasive industrial stagnation, and an alarming increase in national dependency. As Dr. J.A. Ansari aptly states, "We seek to overthrow capitalism—not to reform it." This profound vision necessitates a decisive break from the prevailing IMF framework, a robust restoration of state-led development, and an unyielding commitment to the principles of Islamic moral economy.

Consequently, Islamic movements must vociferously advocate for an immediate exit from the IMF's Extended Fund Facility (EFF), a comprehensive moratorium on debt repayment, and a full, unequivocal revival of the public sector's pivotal role in achieving economic sovereignty. This is not merely an economic imperative, but an undeniable moral and political duty for the nation.

References

International Monetary Fund. (2024). Pakistan: 2024 Article IV Consultation and EFF Review (IMF Country Report No. 24/55). https://www.imf.org

State Bank of Pakistan. (2025). Monetary Policy Statement: January 2025. https://www.sbp.org.pk

Ministry of Finance, Government of Pakistan. (2025). Fiscal Operations Report: Q2 FY25.

https://www.finance.gov.pk

Pakistan Bureau of Statistics. (2025). Sensitive Price Index and CPI Data: May 2025. https://www.pbs.gov.pk

World Bank. (2025). Pakistan Development Update: Managing Debt and Inequality (Spring 2025). https://data.worldbank.org

United Nations Conference on Trade and Development. (2025). World Investment Report: Developing Countries Under Pressure. https://unctad.org

Ansari, J. A. (2025). Economic Prospects and Revolutionary Islamic Response. Institute of Policy Studies.

International Monetary Fund. (n.d.). IMF Country Reports – Pakistan. https://www.imf.org

State Bank of Pakistan. (n.d.). Annual Reports. https://www.sbp.org.pk

Ministry of Finance, Government of Pakistan. (n.d.). Pakistan Economic Survey (various years). https://www.finance.gov.pk

World Bank. (n.d.). World Bank Data – Pakistan. https://data.worldbank.org

United Nations Conference on Trade and Development. (n.d.). Trade and Development Reports. https://unctad.org

Macrotrends. (n.d.). Pakistan Trade Balance Data. https://www.macrotrends.net

Pakistan Bureau of Statistics. (n.d.). Official Statistics Portal. https://www.pbs.gov.pk

Certainty and Change in Capitalist Order:
The Islamic revolutionary response to Digitalization

Javed Akbar Ansari

Capitalism was born in the 11th century in some city states of Italy. Throughout its history it has undergone structural changes while remaining the same, as far as its spirit is concerned. This interplay of certainty and change is intensified in the postmodern era.

Big Tech's Colonization of individuality and Society

Today's global capitalist economy is dominated by relative production stagnation, financialization and rapid increase in interpersonal income and wealth distributional inequalities. Rapid digitalization has led to the macro/systematic dominance of a small handful of tech giants' conglomerates which appropriate surplus through fictitiously enhanced rents and monopolies, rather than through innovation. We are in the era of "intellectual monopoly capitalism".

The growth of monopoly power in the 21st century is not limited to Big Tech. Big Oil and Big Pharma companies are also increasing their monopoly in global markets but Big Tech is more resilient and capable of extending its tentacles much more widely and potentially dominate over most global capitalist sectors. Web users seem to be the leading source of the dominance of information service providers.

Big Tech depends crucially on the support of the capitalist state. But if Big Tech depends on political support of the state, hasn't this always been the case in capitalist history - the history of capitalism subsumes the history of imperialism since at least the fifteenth

century? Can it be argued that Tech Giants are more effective imperialist forces – more effective than imperialist armies, navies and air forces – pushing the global economy in the direction of dispossession and rent seeking?

Globalization, financialization, digitalization are all complementary aspects of the present-day imperialist order. But Big Tech capitalism is creating a new world order in which capitalism no longer extract surplus mainly through the production of basic mass consumed commodities alone but increasingly depends upon political intervention for surplus extraction. This political intervention by imperialist powers guarantees monopolization and increased financial speculation. Hence the universal imperialist emphasis on adherence to globally sanctioned standards and procedures regulating trade, finance and technology transfer within and across national frontiers.

In the new imperialist era dominated by Big Tech there is a policy preference for finance over production. Big Tech imperialism represents a retreat from production facilitated by politically enforced coercion to establishment of relations of appropriation. Subservience to Big Tech necessarily implies a loss of national sovereignty – except for those imperialist powers (effectively America and potentially China) which can guarantee the monopolistic global grip of Big Tech and are designing global transactional procedures to strengthen Big Tech monopolization.

Big Tech monopolization is evident in its social monopolization of time. The web user is entrapped in Big Tech's monopolistic grip on a whole-time basis. Big Tech commodifies time through the commodification of almost all aspects of individual and social life – religion, health, education and entertainment. All are turned into fictitious commodities. This leads to a near total loss of personal identity and the "autonomy" that capitalism is supposed to generate. Big Tech commodifies the quality of mankind's life. No form of life – activity, thought – escapes commodification by Big Tech monopolization. Every moment of the individual's life is a moment of and for the Valorization of "intellectual" capital.

Digitalization affects the form of socialization. Digitalization does not commodify in the traditional sense. Most services offered on the net are commodified at a secondary level through advertising. They entrap their users within a capitalist algorithmic loop. Digital platforms are ecosystems that manipulate social interactions on the basis of detected patterns of behavior among unrelated people. Their output – services given to the users – and their input – the information the user provides – are indistinguishable. The wider the user web network, the more effective the services provided. This induces the Big Tech service providers to offer free access to their services. This strengthens the social dominance of the Big Tech companies.

The success of Big Tech companies is focused on

enhancing social control. Their capacity to anticipate and influence behavior patterns depends on the scope and amount of data collected. Data use is necessarily biased through hidden criteria embedded in the design of the digital platform. This strengthens the monopolistic stronghold of Big Tech on individual consciousness.

Capitalism is evolving in such a way that Big Tech monopolists invest in and create mass intangible assets that generate new forms of social control. The expansion of their business gives Big Tech unlimited access to social power. Data itself is not the source of this social power. It is the user metrics—number of users, level of interaction among them—that are the crucially important assets of Big Tech. It is through the user network that Big Tech companies control and manipulate data, extending the social space under Big Tech's control.

Digitalisation, Capitalist Individuality and the State

The development of digital technology significantly affects the capitalist mode of production. It augments rent-taking and the appropriation of unpaid labour as a means of surplus extraction; however, the fundamental nature of the relationship between labour and management in the production process does not change. Big Tech employs hundreds of thousands of workers, invests billions in tangible assets, and manages and controls both employed labour and invested fixed capital in the conventional way.

Does the partial – though growing – transition from profit to rent as a source of surplus extraction represent

a change in capitalism's spirit?

Capital is essentially a spiritual, not a material, process. It is a manifestation of the evil forces of *hirs* (avarice) and *hasad* (covetousness) which embed themselves in wealth and men's souls and circulate through them for never-ending self-expansion. As spiritual forces, *hirs* and *hasad* (capital) know no limits. Throughout its history, capital has grown by entrapping more and more men and women in the vicious grip of *hirs* and *hasad*.

Digitalization is a means for enhancing capitalist individuation and socialization. It strengthens capitalist individuation by entrapping billions of men and women in the circuit of capital (driven by greed and envy) through constant commodification of their desires and consumption. The billions of users are Big Tech's workers, supplying and utilizing capitalist services. It socializes personal interaction to articulate the capitalist spirit (*hirs* and *hasad*). It significantly speeds up the process of capitalist individuation and socialization and impedes the growth of non-capitalist valuation systems. It is unambiguously an evil force seeking domination over individuality and society.

Moreover, Big Tech is an imperialist artefact. The internet is an invention of the US Department of Defense, and the American imperialist state is the ultimate guarantor of Big Tech's global reach. Imperialist stooge agencies – WIPO and WTO – have crafted the intellectual property regulatory regimes which undergird Big Tech's systemic dominance. Big Tech is the main technical instrument servicing the

imperialist surveillance system.

Big Tech's systemic dominance represents a change in the structure of capitalist production and exchange – a change which widens the scope for the dominance of the capitalist spirit (*hirs* and *hasad*).

The Islamic Revolutionary Response

The domination of the capitalist spirit (*hirs* and *hasad*) at the individual and the social level can and should be resisted by Islamic revolutionary forces. The issue of Big Tech Capitalism must not be accepted as an inevitable, irreversible process.

Capitalist order is designed as an opaque system of power governance. But Islamic revolutionary praxis can strategically penetrate this opaque veneer. Capital seeks to shield its power through a network of procedures and institutions which are designed to obscure its brutal power.

The key instrumentality for deconstructing capitalist order is the Islamic state – as Maulana Maududi and Imam Khomeini (may Allah bless them) recognized several decades ago. The state is the means for contesting the growth of capitalist individuality and society – without the resources of the state the Mukhliseen-e-Deen remain powerless to influence governance structures of social order and to control capitalist individuation and socialization.

Alhamdulillah, we possess two Islamic states in Iran and Afghanistan (and other Islamic states will Insha'Allah emerge in Sahili Africa). Iran already has taken several steps to thwart infiltration of cyberspace by Big Tech. Afghanistan is also seeking to develop (in

association with Iran's expertise) a proactive information protection policy. Both Islamic states must take action to develop indigenous platforms geared to serving Islamic objectives not linked to advertising-generated income. Delinking with Big Tech should be seen as a complementary effort to delink from the *gharar*-and-*riba*-based global financial system.

In non-Islamic Muslim states – such as Pakistan, Turkey and Indonesia, Islamic revolutionaries and Islamic communities must recognize the danger of using imperialist-funded digital platforms. We must remember that we triumphed in the Afghan jihad without a major use of digital technology and we frustrated imperialist surveillance efforts using non digitized technology.

Today, in non-Islamic Muslim states IT use is widespread. Its most lethal weapon, the mobile cellular phone, is vastly popular. Most madrasas are offering computer training. Islamic parties are organizing career IT programs for members. All this is counter-productive as it opens up Islamic activities to imperialist surveillance and sabotage. More importantly, it accelerates the process of capitalist individuation and socialization in the country. Islamic identity consciousness cannot flourish if it is subjected to capitalist commodification. We must oppose these trends and craft a strategy to revert to mosque and community-based communication networks.

Financial Capitalism: An Islamic Revolutionary Approach

Javed Akbar Ansari

Finance is a capitalist invention. It represents the penetration of production and trade by usury (*riba*) and speculation (*gharar*). As capitalism flourishes, *riba* and *gharar* increasingly penetrate trade and production transactions. The capital accumulation process is increasingly regulated through the functioning of financial markets, which increasingly assign value to more and more economic activities through the reconstitution of assets. Finance dominates production and trade.

Productivity, money, and trade have existed throughout human history, but *riba* and *gharar*-based activities were not legally legitimized until the twelfth century, and even then, only in a small number of Italian city-states. In non-capitalist states, usury and speculation were usually punished under the law. A non-capitalist economy, therefore, does not tolerate the existence and functioning of financial markets.

Today, finance lies at the heart of the capital accumulation process, yet its management has proved problematic for capitalism's macro-managers. As financialization – the increased penetration of production and trade transaction structures by *riba* and *gharar* – proceeds, production growth tends to fall and investment opportunities in the real economy disappear. Capital market profits do not result in a corresponding increase in production and trade. The link between the growth of financial markets and the

real (productive) economy is weakening all the time.

As production stagnates, financial sector growth serves to bolster aggregate consumer demand, principally through the provision of loans. The principal monetary instrument available to capitalist policymakers is the usury rate. However, once the base usury rate has been reduced to zero (as was done following the 2008-10 banking crisis), it can no longer be used to stimulate investment. To compensate for monetary policy ineffectiveness, more government spending is required – which leads to a rapid growth in public debt. The growth in consumer and public debt further stimulates financialization.

Stagnation and Financialization

Stagnation – a decline in the rate of growth of an economy – occurs as capitalism matures. There are two fundamental reasons why this happens. First, as the capitalist way of life dominates society, zina spreads widely, women become wage labourers, nikah tends to disappear, and the family disintegrates. This leads to a continuing fall in the aggregate demand for physically consumable goods and services.

Secondly, as capitalism matures, capital concentrates and centralizes. This is what is meant by capital accumulation. Accumulation naturally and necessarily leads to the monopolization of markets. Competition becomes oligopolistic. Inequality in the distribution of wealth and income grows. More is produced than can be sold. Investable funds increase while the opportunity for their profitable investment in the real economy declines.

Both tendencies contribute to financialization. As population falls and ages, demand switches from physical consumables to financial markets – physical consumption has limits, but *hirs* and *hasad* – concretized in finance – are boundless. Companies which cannot find opportunities for profitable investment in the real economy hoard their savings in financial markets. Debt grows exponentially and the monopolization increases as the tendency is intensified. This further produces stagnation.

Financialization is both a cause and a response to stagnation. It mops up the excess supply of investable funds that cannot be invested in the productive economy. It substitutes loans for stagnant wages and taxes to stimulate aggregate demand and growth in imperialist expenditure – through enhanced militarization and soft power deployment – of the major capitalist countries.

Nevertheless, the growth of the financialization of capital accumulation aggravates capitalist crisis tendencies through the amassing of potentially unredeemable public and private debt.

Today, financial stocks dominate the global productive economy. Financial institutions have invented a wide range of debt-related mechanisms (derivatives) to absorb the investable funds that flow into speculative transactions. Central banks stand ready to act as 'lenders of last resort' and pump in near zero-interest-based funds to salvage overextended banks and non-bank financial institutions. This newly institutionalized financial infrastructure is a key

component of the globalized imperialist order.

In capitalism's history, financial market growth usually occurs during periods of expansion. The post-1990 growth of financialization is unique in that it has occurred while capitalist growth has stagnated. Today, capitalism's productive base is shrinking relative to the enormous weight of its financial sector. The financial sector prospers while the real economy stagnates.

The growth process is debt-fueled. Eventually, financialization is the growing indebtedness of public and private aggregate demand. Financialization postpones the occurrence of capitalist crisis. It does not address its fundamental causes – the decline in population growth and increased monopolization of markets – which leads to an inevitable stagnation of aggregate demand.

Thus, the stagnation deferral capacity of financial markets depends crucially on the ability of the capitalist state to pump in cheap liquidity at times when crises loom. Financialized capitalism lurches from crisis to crisis (1987, 1992, 1994, 1997–98, 2000, 2008–10, 2020–21) and each time a systemic meltdown is prevented by the intervention of the capitalist state through the provision of interest-free loans.

Growth in the financialized economy depends especially on the growth of debt, especially corporate financial debt – which in America currently exceeds 120 per cent of GDP and a slowdown/decline in the growth of which was a major cause of the 2008–2010 crisis. Financial market bubbles are the main sustainers of capitalist growth in the current era, but financial

booms are necessarily short-lived. Capitalist crisis re-emerges.

Financialization is thus a temporary palliative to address capitalist disaster. It does not address the basic contradiction – decline in population growth and increased monopolization – of the capitalist order.

The Effects of Stagnation

As a capitalist economy stagnates, distributional inequalities (of both wealth and income) increase. Capitalist work processes become precarious and the monopolization of markets grows. Opportunities for profitable investment in the production sectors shrink and financialization feeds upon itself.

Financialization is increasingly digitized, which means that expansion of the financial sector leads to relatively less growth. The role of the capitalist state as a saviour of capitalist crises becomes of vital importance during periods of capitalist stagnation. Underutilization of production capacity soars in such periods, thus depressing (net) investment growth. Investable funds are hoarded by corporations – amounting in 2010 to over $3 trillion in America, representing more than one third of GDP.

In periods of stagnation, corporations use liquid resources to buy other corporations and buy back their own shares. This fuels speculation and increases financial riskiness and financial exposure. Investment in the real economy – gross domestic capital formation – declines. Average investment growth in non-residential physical investment in America has fallen from 7 per cent during 1960–70 to 3 per cent during

2010–2018. New investment in structure and equipment has fallen even more sharply.

The Islamic Response

The capitalist global economy is in the grip of financialization – short-term growth spurts fueled by financial bubbles are inevitably followed by crises which are staved off by the growth of government debt. This vicious boom-bust cycle can be broken if capitalist governments find means external to the financial sector to stave off stagnation.

In the past, militarization has played such a role. In the future, two imperialist wars – both among imperialist countries (America, Russia and China) and proxy wars fought in client states (Ukraine, Taiwan, Israel, Bharat/Kashmir) – can serve this purpose.

Another "external" stimulus to counter stagnation may be produced by the emergence of new technologies – but the employment impact of the new ICT technologies that have emerged in the 21st century is limited. The introduction of robotics and AI technologies has a negative impact on growth. Moreover, the "austerity" policies of capitalist governments – whereby cash flows to the real economy are systematically redirected to the financial sector – accentuate financialization and hence the crisis-proneness of the system.

Stricter financial regulation is hindered by the impotence of nation-states vis-à-vis the forces of global capital. Furthermore, accelerated financialization is needed to overcome stagnation tendencies generated by the systemic tendencies of falling production and

rising monopolization levels. Stricter financial regulation tends to deepen stagnation tendencies. Capitalist policymakers are the first to financially deregulate.

The standard capitalist response to stagnation and deflation has been stimulation of domestic consumer demand through increased government expenditure. This is no longer feasible in postmodern capitalism – where production of the financial systems has been globalized as the rentier financial interest groups dominate the economy and the state.

Thus, there are no viable capitalist 'fixes' available at the moment to the dilemmas of stagnation/ financialization. From an Islamic perspective, we seek the overthrow of capitalist order, not its reform. This must involve the abolishing of finance and its replacement by tamveel. This can only be done by an Islamic state (Iran and Afghanistan).

A tamveeli system will have the following characteristics:

* Money will be created solely by the State banks. Tamveeli institutions will not create deposit money. They will observe hundred per cent reserve banking.

* Money and credit creation will be governed by currency and credit planning. The currency and credit plan will be derived from the national production plan.

* The rate of growth of money supply will be related to the rate of growth of aggregate production (GDP).

* All banks, insurance companies, and intermediaries will be nationalized.

* There will be no money market or capital market

in the economy. There will be no risk and speculation-based loan transactions. Interest and speculation-free lending and borrowing will be facilitated through the means of tamveeli investment.

* No foreign currency will be allowed to circulate in the national economy.

* All foreign inflows will be surrendered to the Islamic government, which will convert them into local currency at a managed foreign exchange rate.

* A portion of foreign exchange will be allocated to importers and others through rationing.

* National tamveeli institutions will not have relations with global money and capital markets involving interest and/or speculative returns on payments.

* Exchange rate value will be determined by the government and managed through banks.

* Public and private borrowing will be prohibited. There will be no public or private debt of the currency.

* The Islamic government will not acquire membership of international financial institutions – IMF, ADB, World Bank, Islamic Development Bank etc. It will not keep its foreign exchange resources in any foreign countries.

An attempt to set up an embryonic tamveeli system in countries where there is a significant halal economy is a requirement. Such a tamveeli system will have the following characteristics:

* A halal business which deals in Shariah-permitted business activities and has no dealings with the money and capital markets.

* An Islamic organization (Tablighi Jama'at) may identify, in a certain area, halal enterprises being run by its members which have good prospects of growth.

* Tablighi Jama'at may receive funds from its members, associates and supporters to invest in selected halal businesses.

* Tablighi Jama'at may coordinate agreements between savers and investors in halal business on musharika/modarba/ijara bases.

* Tablighi Jama'at must serve as a quasi-public sector and must not share in the profit earned through investment in halal businesses.

* Tablighi Jama'at must validate the character and honesty of all members – that is why the borrowing under this scheme must remain restricted to the members of Tablighi Jama'at – and participate in dispute settlement.

* A central office must be established by the Tablighi Jama'at to coordinate the implementation of this scheme on a national basis.

Rethinking the Stock Market: An Islamic Perspective on Modern Finance

Syed Muhammad Younus Qadri
Smyounus121@gmail.com

Introduction

The stock market stands as one of the central pillars of the global capitalist economy. Promoted as a mechanism for economic growth, capital mobilization, and investor participation, it has become deeply embedded in modern financial systems. However, from an Islamic perspective grounded in the principles of Shariah, the stock market—particularly the secondary market—raises profound ethical and structural concerns. This article explores the philosophical, legal, and practical criticisms of the stock market from an Islamic viewpoint and proposes Shariah-compliant alternatives rooted in partnership, transparency, and real economic activity.

The Stock Market as Capitalism's Financial Engine

The stock market emerged alongside the rise of capitalism and reflects its core tenets: the ownership of capital, free markets, and the pursuit of profit. At its core, the stock market fundamentally relies on abstractions like ownership without direct control, and the trading of stock itself often occurs independently of the underlying real economic activity or tangible assets. Shareholders, frequently distant from the companies they invest in, hold fractional ownership and influence decision-making indirectly, if at all.

The Rise of the Corporation and Legal Personhood

Corporations, as legal persons, can own property and engage in contracts independently of human owners. Their ownership is fragmented among potentially millions of shareholders, leading to a separation between ownership and management. Decisions are made by professional executives, whose focus is typically on maximizing shareholder value, often at the expense of ethical or social considerations. This setup contradicts Islamic notions of responsible ownership and accountability.

Primary vs. Secondary Markets

While companies initially raise funds in the primary market through Initial Public Offerings (IPOs), the majority of stock trading occurs in the secondary market. Here, shares change hands between investors without any involvement from the issuing company. The secondary market is dominated by speculation, driven by anticipated price movements rather than the underlying productive value of the company, and is largely disconnected from the productive economy.

The Fragility of the Secondary Market

The secondary market, particularly in its conventional form, harbours inherent fragilities that stem from its operational dynamics. The widespread use of speculation and borrowed funds (leverage) frequently inflates asset prices beyond their intrinsic value, creating an unstable environment where confidence, once lost, can lead to devastating crashes. Furthermore, markets are not solely driven by economic fundamentals; they are highly susceptible to

non-economic triggers such as geopolitical news, rumors, and shifting investor sentiment. This susceptibility can lead to financial contagion, where localised panic selling quickly escalates into global crises due to the interconnected nature of financial systems. Consequently, even small events can trigger large-scale systemic risks, amplified by the inherent fragility of highly leveraged and interconnected markets.

Trading Value Before Production (Rise of Financial Abstraction)

A significant concern within the modern financial system is the pervasive practice of trading value before real production, leading to an increasing reliance on financial abstraction. Commodity futures, for instance, are contracts that allow the buying and selling of goods before their actual production. While ostensibly intended for hedging against price fluctuations, they are extensively utilised for pure speculation. Similarly, derivatives—a broad category encompassing instruments like futures, forwards, and options—are financial contracts whose value is derived from an underlying asset. These tools facilitate profits or losses that are often entirely disconnected from any real economic activity or tangible asset creation, embodying a fundamental separation between financial gains and productive enterprise.

Islamic Critique of the Stock Market

From a Shariah perspective, several critical flaws render the modern stock market problematic**:**

- **Erosion of Private Ownership**: Ownership in Islam

implies responsibility and knowledge of the asset. The anonymity and detachment of shareholders violate this principle, as they often have no direct control or understanding of the underlying businesses.

- **Prevalence of Gharar (Excessive Uncertainty)**: Speculative instruments like derivatives involve high uncertainty and ambiguous terms regarding future prices and conditions, contradicting Islamic norms of contractual clarity and fairness.
- **Speculative Behaviour and Maisir (Gambling)**: The market's emphasis on short-term gains and price movements, rather than underlying productive value, encourages speculative behavior that is akin to gambling (maisir), which is strictly impermissible in Islam.
- **Interest-Based Transactions (Riba):** Practices such as margin trading and the use of certain debt-based instruments within the stock market involve interest payments (riba), directly violating a fundamental prohibition in Shariah.
- **Short Selling and Lack of Asset Ownership**: Short selling, which involves selling assets one does not yet own with the hope of buying them back at a lower price, introduces significant Gharar and is impermissible under Islamic law, as it violates the principle of owning what is sold.
- **Neglect of Social Responsibility**: Islamic tamweel system is inherently value-driven and prioritises community well-being, ethical conduct, and real economic benefit. In contrast, conventional stock markets often prioritise profit maximisation above all, potentially at the expense of broader ethical or

social considerations.

No Need for Stock Market: An Islamic Viewpoint

In light of the structural and spiritual contradictions with Islamic system of tamveel, there is a compelling argument that modern Muslim societies do not require the stock market. Islam promotes partnership-based financing through:

Mudharabah: A trustee partnership where one party provides capital and the other manages the business.

Musharakah: A joint venture where all parties contribute capital and share profits and losses.

These models are based on trust, direct knowledge of the enterprise, and moral responsibility. Typically involving 10–20 partners who know each other, such arrangements preserve ethical investment practices and eliminate speculative trading.

A Better Alternative: Ethical, Localised Investment

Islam advocates for investments that are fundamentally different from those found in conventional markets, prioritising tangible assets, transparency, and shared responsibility. Truly Islamic investments are backed by real, identifiable assets, governed by complete transparency in all dealings, and grounded in mutual consent and shared risk among all parties involved. Furthermore, they emphasise accountability to real stakeholders, ensuring that the enterprise serves a broader purpose beyond mere profit maximisation.

Trading of Shares in Islamic Businesses

In this alternative model, shares in such ethically grounded businesses are not publicly traded on

secondary markets. Instead, the ownership of shares is generally not transferable to external parties in the open market. If a partner wishes to exit an investment, the company facilitates an internal liquidation or a sale to existing or approved partners. This approach maintains the integrity and trust within the partnership, preventing speculation and ensuring that ownership remains with those committed to the business's real economic activity.

The Role of Tamweeli Institutions

Implementing such a model in modern economies requires innovative structures. Tamweeli Institutions (Islamic 'financial' institutions) can play a crucial role in bridging the gap between traditional Islamic principles and contemporary tamveeli/'financial' needs.

Fund Mobilisation and Economic Growth: Large-scale ventures that require significant capital can still be financed through these Tamweeli Institutions. They would effectively pool resources from investors via Shariah-compliant arrangements such as Mudarabah (profit-sharing, loss-bearing by capital provider) and Musharakah (joint venture, profit/loss sharing by all partners). This ensures that 'capital' is mobilised for productive economic growth while strictly adhering to Shariah principles.

Liquidity and Investment Flexibility: Addressing the need for liquidity without resorting to speculation, Tamweeli Institutions can create structured exit mechanisms. These might include pre-agreed share sales to existing partners, sales to other approved

investors within the institution's network, or systematic profit redistribution. This approach ensures investors can access their funds ethically, maintaining integrity without the volatility and detachment of the secondary market.

Risk Diversification: Rather than relying on anonymous diversification through conventional stock markets, Tamweeli Institutions offer a more principle-driven approach to risk management. They facilitate sector-based diversification rooted in real ventures and genuine profit/loss sharing models. This means investments are spread across different tangible economic activities, providing diversification based on real-world performance rather than speculative financial instruments.

Conclusion

The stock market, especially its speculative secondary segment, conflicts fundamentally with Islamic economic values. It prioritises abstraction over reality, speculation over production, and profit over ethics. Instead of mimicking Western capitalist models, Islamic societies should develop financial systems based on trust, transparency, and tangible outcomes. Indeed, Mudarabah, Musharakah, and the emergence of Tamweeli Institutions offer robust, ethical, and Shariah-compliant alternatives capable of fulfilling both the spiritual and material objectives of Islamic system. Reclaiming this ethical foundation is not only a religious necessity but an economic imperative for a just and resilient future.

Book Review: *Empire of AI: Dreams and Nightmares in Sam Altman's OpenAI* by Karen Hao, Penguin Press, New York, 2025.

The Empire of AI: A Secular Revelation in the Age of Technocratic Idolatry

Dr Syed Z. Arshad

In recent years, the rapid advancement of artificial intelligence has emerged not merely as a technological phenomenon but as a socio-political force that is reshaping global power structures. At the forefront of this transformation stands OpenAI, a company whose meteoric rise has been both celebrated and critiqued as a symbol of Silicon Valley's new imperial ambition. *Empire of AI: Dreams and Nightmares in Sam Altman's OpenAI* by Karen Hao, a seasoned technology journalist with experience at MIT Technology Review and The Atlantic, offers a timely and incisive investigation into this unfolding reality.

This book is more than a corporate exposé. It serves as a lens through which the reader can observe the interplay of technological ambition, capitalist ideology, and the ethical hollowness that characterizes modern industrial civilization. Hao's narrative traverses the inner workings of OpenAI, the constructed charisma of its CEO Sam Altman, and the profound global implications of artificial intelligence development. Drawing on more than three hundred interviews and first-hand exposure to both elite tech institutions and impacted communities across the world, Hao demonstrates that *artificial intelligence is far from a neutral tool*. Rather, it is being shaped by the

interests of a small and powerful elite who seek to define the destiny of mankind through their own vision of progress.

This review approaches Hao's work not merely as a record of corporate drama but as an essential text for those engaged in the Islamic struggle for civilisational revival. It will explore how the promises and perils of OpenAI reflect the broader moral and epistemological crises of the capitalist order, particularly its effort to claim authority over knowledge and ethics without any reference to divine guidance. As the Muslim ummah faces the incursions of techno-capitalism, this book presents a vital opportunity to reflect upon how we must respond, not only with critical analysis but with grounded and confident alternatives anchored in the revelation of Allah.

Summary of the Book

Empire of AI is structured as a narrative history and critical exposé of OpenAI, tracing its evolution from a non-profit idealistic initiative to a central player in the global capitalist pursuit of artificial general intelligence. Karen Hao begins with the dramatic boardroom events surrounding the temporary ousting of Sam Altman in late 2023, an episode that exposed deep internal fractures and competing visions within OpenAI. It is here that the non-profit origins of the company fully transformed into a for-profit vision. From there, she expands the narrative backward and forward, mapping the ideological, political, and economic forces that have come to define the company's mission and methods.

The book is divided into four thematic parts, each highlighting a different stage of OpenAI's transformation. Early chapters explore the philosophical and strategic foundations of the organisation, including its original claims to ethical stewardship and openness. Hao delves into the personalities behind the project — Altman, Elon Musk, and others — showing how their personal ambitions and ideological commitments shaped the institution's trajectory.

As the narrative unfolds, Hao documents OpenAI's pivot from a non-profit to a "capped-profit" structure, its deepening entanglement with Microsoft, and its growing *dependence on massive computational power, data extraction, and global labour exploitation*. Through vivid reporting and global case studies, she shows how OpenAI's ambitions have led to extractive practices that mirror colonial logic — drawing on the intellectual labour of data workers in the Global South, consuming vast natural resources, and reshaping labour markets with little regard for justice or consent. This she terms the imperial ambition ('Empire of AI').

The book concludes with a sobering reflection on the unchecked power of a few technology firms to steer the future of humanity, often through opaque decision-making and ideological absolutism. Hao warns that *OpenAI's pursuit of artificial general intelligence is no longer a matter of scientific exploration but a race for dominion over the infrastructure of thought itself*.

Capitalist Epistemology and Technocratic Empire

From an Islami (*inqilabi*) perspective, one of the

more important contributions of Karen Hao's book lies in its unmasking of artificial intelligence as an extension of capitalist epistemology. Far from being a neutral science, the development and deployment of AI reflect a particular worldview rooted in control, accumulation, and utilitarianism. Hao has demonstrated that OpenAI's trajectory is not simply about building intelligent machines; *it is about redefining what knowledge is, who has the right to produce it, and who benefits from its fruits*.

In this vision, knowledge is reduced to data, and wisdom is measured by predictive accuracy. The purpose of intelligence becomes narrowly functional, assessed by its ability to optimise outcomes within a predefined economic framework. AI systems are trained on the digital exhaust of billions of people across the globe, yet their ownership and benefits are concentrated in the hands of a few elite corporations and venture capitalists. *This is a knowledge regime that mirrors the colonial order*, where the wealth of the many is extracted and processed to serve the ambitions of the powerful few.

This epistemology stands in stark contrast to the Quranic conception of knowledge as a trust from Allah. In Islam, knowledge ('ilm) is not only a means of understanding the world; it is also a path to moral clarity and spiritual elevation. The purpose of intelligence is not to dominate nature or other human beings but to recognise the signs of the Creator and to live justly (i.e. according to His guidance). As the Quran says, "He taught Adam all the names . . . ."

(Surah Al-Baqarah 2:31), signifying a knowledge that is both descriptive and purposeful, grounded in accountability and divine ethics.

OpenAI's framework, by contrast, advances an arrogant technocratic vision that seeks to automate not only labour but also judgement, morality, and even imagination. As Hao writes, the creators of AI models such as GPT-4 are effectively building systems that reflect and reinforce their own ideological biases, while presenting them as universal and objective. This is a form of secular absolutism, one that refuses to acknowledge its own limits or the possibility of transcendence.

In Islamic terms, such a system represents a modern incarnation of *taghut*—a false authority that claims the right to legislate and guide without reference to Allah. The Quran warns against such forces, which mislead mankind under the guise of progress. "Have you seen the one who takes his desire as his god?" (Surah Al-Jathiyah 45:23). The AI paradigm described in this book is precisely such a construct, where technological power is sanctified and human submission to divine guidance is marginalised.

Islamic Perspective: Knowledge, Ethics, and Power

The Islamic worldview offers a comprehensive alternative to the moral and epistemological framework that underpins modern artificial intelligence. In Karen Hao's analysis, the development of AI technologies is shown to be shaped by corporate priorities, profit incentives, and ideological ambitions. From an Islamic standpoint, such a process is not only

ethically deficient but spiritually misguided.

In Islam, knowledge is not a commodity to be extracted and monetized. It is a sacred trust that must serve the higher objectives of divine guidance. The Quran frequently associates knowledge with moral responsibility. "*Indeed, the hearing, the sight, and the heart — all those will be questioned*" (Surah Al-Isra 17:36). This verse reminds us that every act of observation and inference carries with it a duty of righteousness. When knowledge is divorced from divine purpose, it becomes a tool of manipulation and oppression.

The pursuit of artificial general intelligence, as depicted in Hao's work, is driven by a secular aspiration to create intelligence without accountability. The belief that machines can replicate or surpass human moral reasoning assumes that ethics can be encoded without reference to Revelation. Islam categorically rejects this assumption. Ethics in Islam are not derived from consensus or utility but from the commands of Allah and the Sunnah of His Messenger ﷺ. Any claim to moral authority that does not submit to divine legislation is inherently flawed.

Moreover, the Quran condemns the hoarding and unjust distribution of resources. "*Woe to those who give less [than due]*" (Surah Al-Mutaffafin 83:1). The book details how AI companies like OpenAI accumulate vast datasets and compute resources while marginalizing the rights of the very populations whose data fuels their systems. Workers in poor countries are underpaid, artists are exploited, and water resources are depleted to train these models. From an Islamic

perspective, such exploitation is not just unethical. It is a form of modern-day injustice that violates the 'rights' of creation and disrupts the balance (mizan) that Allah has established in the world.

The Islamic economic vision demands that knowledge and resources be used for the benefit of all and that technology be restrained by the limits of divine law. This includes protecting man's dignity, ensuring economic equity, and preserving the environment. Any AI development that undermines these principles, no matter how advanced, cannot be considered acceptable in the Islamic sense.

Islamic Revivalism and the Technological Frontier

Karen Hao's Empire of AI inadvertently confirms a truth long upheld by Islamic movements committed to revival. *The technological order emerging from capitalist foundations is neither neutral nor benign*. It is an extension of a worldview that displaces divine sovereignty and substitutes it with human ambition, corporate control, and speculative promises. The development of artificial intelligence as described in the book is not simply a scientific project. *It is a civilizational claim to define intelligence, ethics, and the future itself without reference to the Creator.*

For those engaged in the struggle for Islamic revival, this presents both a challenge and an opportunity. The challenge lies in resisting the absorption of Muslim societies into this technocratic empire that seeks to universalize its vision through tools of data, algorithms, and global economic coercion. Muslim thinkers, scholars, and leaders must

recognize that the current AI paradigm is not merely a tool to be adopted. It is a structure of thought and power that must be interrogated at its roots.

At the same time, the Islamic tradition offers the resources needed to build a principled alternative. The concept of khilafah reminds us that man is a steward of creation, not its master. Our role is not to simulate or replicate divine attributes through artificial intelligence but to live in accordance with the guidance of Revelation. Islamic ethics, based on the Qur'an and Sunnah, can serve as a framework to guide technological development toward justice, balance, and collective benefit.

This calls for an ambitious revivalist project. Muslim scholars and technologists must collaborate to articulate an Islamic philosophy of technology. Institutions must be developed to research, regulate, and produce AI tools that serve the real needs of the ummah, including education, health, and governance, without surrendering to the imperatives of profit and global competition. Rather than imitating the West, Muslim societies must pursue technological self-sufficiency & independence under the principles of the shari'ah.

The revival of Islamic civilization will require not only critique but constructive alternatives. This includes asserting control over data, protecting intellectual and natural resources, and resisting the commodification of human experience. It also requires reclaiming the narrative of progress from those who define it only in material terms. True progress is not

measured by computational scale but by moral clarity, justice, and submission to the will of Allah. As the Qur'an reminds us, "*Indeed, the most noble of you in the sight of Allah is the most righteous of you*" (Surah Al-Hujurat 49:13). This is the only standard by which man's advancement should ultimately be judged.

Conclusion

Karen Hao's *Empire of AI* is a rare and courageous account that unmasks the ideological machinery driving the age of artificial intelligence. Through careful documentation and global testimony, the book reveals how the AI revolution, rather than delivering universal benefit, has entrenched inequality, concentrated power, and projected a secular utopia shaped by a handful of corporate elites. It is a sober reminder that the tools of modernity, when built upon the foundations of profit and self-deification, will continue to marginalize the spiritual, ethical, and communal dimensions of man's life.

For Muslims engaged in the struggle to revive Islamic civilization, this book is both a mirror and a map. It reflects the crisis of a world that has severed its relationship with divine guidance, and it maps the consequences of allowing unaccountable power to shape the future. The Islamic response must not be confined to critique alone. It must involve the active reassertion of tawheed in every domain of life, including technology and knowledge production. Our engagement with artificial intelligence must be shaped not by a desire to compete on the terms of others, but by the conviction that only the guidance of Allah offers

true justice, balance, and mercy.

As the Prophet ﷺ said, "Indeed, the world is sweet and green, and verily Allah is going to install you as vicegerent in it in order to see how you act. So avoid the allurement of the world…" (Sahih Muslim 2742). This hadith serves as a profound reminder of our responsibilities and the trials that accompany worldly engagements. This stewardship is a trust, not an entitlement. It obliges us to challenge false authorities, reject exploitative systems, and build societies where knowledge, power, and resources serve the purpose for which they were revealed — to worship Allah and uphold His commands on the earth.

In this task, the ummah must move forward with courage, clarity, and the unwavering belief that *guidance lies not in artificial intelligence, but in divine revelation*!